إن من البيان لسحرا (الحديث)

خطباتِ حکیم العصر

افادات

حکیم العصر، محدث دوراں

ولی کامل۔ مخدوم العلماء

حضرت اقدس

مولانا عبد المجید لدھیانوی صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ باب العلوم

کہروڑپکا ضلع لودھراں

جلد ہفتم

استاذ العلماء
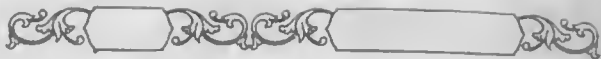
ترتیب: حضرت مولانا مفتی ظفر اقبال مدظلہ

ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھمّ صلِّ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ

کما صلّیتَ علیٰ ابراہیمَ وعلیٰ آلِ ابراہیمَ

اِنّکَ حمیدٌ مجیدٌ

اللّٰھمّ بارِکْ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ

کما بارکتَ علیٰ ابراہیمَ وعلیٰ آلِ ابراہیمَ

اِنّکَ حمیدٌ مجیدٌ
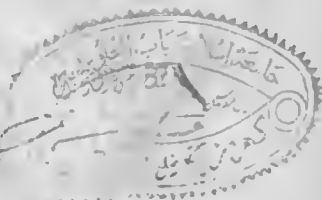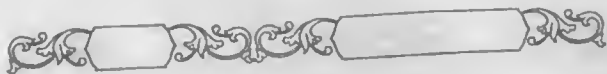
حکیم العصر، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید دامت برکاتہم العالیہ کے

علمی خطبات کا حسین مجموعہ

خطبات حکیم العصر

جلد ہفتم

مکتبہ شیخ لدھیانوی

جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا ضلع لودھراں

فون: 0300-6804071

ضابطہ

نام کتاب: .... خطبات حکیم العصر (جلد ہفتم)

خطیب: .... حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی مدظلہ

اہتمام: .... استاد العلماء مولانا مفتی ظفر اقبال مدظلہ

ترتیب وتخریج: .... مولانا محمد عمران

ضخامت: .... 348 صفحات

تعداد 1100

اشاعت اول: .... جون 2008ء

قیمت: .... 200 روپے

واحد تقسیم کنندگان

مکتبہ شیخ لدھیانوی باب العلوم کہروڑ پکا ضلع لودھراں

فون:

0300-6804071 - 0300-6833824

0300-7807639 - 0306-4181660

انتساب

میرے تمام اساتذہ کرام کے نام

جن کی محنت، محبت، توجہ اور کاوشوں نے مجھے اس مقام پر پہنچایا۔ اللہ عزوجل ان عظیم محسنین کو شایان شان جزا عطا فرمائے۔ (آمین)

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ناشر

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

شرک کی حقیقت

عقیدہ ربوبیت

قرآن ایک عظیم معجزہ

عظمتِ قرآن

ہم مدینہ کیوں جاتے ہیں؟

علم کے تقاضے

قصہ یوسف

عظمتِ مدارس

تقویٰ (اول)

تقویٰ (دوم)

دعا کی اہمیت

فضیلت لیلۃ القدر

آداب معاشرت

راہ استقامت کے راہرو

سازشی ٹولہ

پیش لفظ

اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا تعلق ایسی قدسی جماعت (علماء دیوبند) سے ہے۔ جس نے دین حق کی ہر پہلو سے حفاظت کی ہے۔ اور ہر طرف سے اس کی چوکیداری اور خدمت کی ہے۔ قلم کے ذریعے بھی' زبان کے ذریعے بھی' تربیت کے ذریعے' تعلیم کے ذریعے بھی۔

جن اداروں میں تزکیہ و تربیت کے ذریعے دین کی خدمت ہوتی ہے ان کو خانقاہ کہا جاتا ہے۔ اس شعبے میں نائب قیوم زمان سلسلۂ نقشبندیہ کے سرخیل حضرت خواجہ خان محمد صاحب دامت فیوضہم کا نام نمایاں ہے۔ آپ نے روحانی تربیت کے ذریعے اشاعتِ دین اور مسلک حق کا وہ کام کیا ہے اور کر رہے ہیں جو اپنی مثال آپ ہے۔ آپ بلا شک و شبہ مرجع الخلائق ہیں۔ اور علماء دیوبند میں اس حوالے سے آپ ہی کا فیض ہے جس سے امت مسلمہ خوب سیراب ہو رہی ہے۔ اللہ آپ کی زندگی میں کروڑوں برکتیں عطا فرمائے اور آپ کا سایہ تادیر ہم پر قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اسی طرح سلسلہ رائے پور کے سرتاج حضرت اقدس نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تادمِ آخری فیض ربانی کو خوب سے خوب تر پھیلایا اور اسی حالت میں دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

اور جن اداروں میں تعلیم و تعلم کے ذریعے دین کی خدمت ہوتی ہے ان کو مدارس کہا جاتا ہے۔ اس پہلو سے ہمارے سامنے حکیم العصر حضرت استاد جی دامت برکاتہم کا نام نمایاں ہے۔ جو نصف صدی سے زائد عرصے سے یہ عظیم خدمت انتہائی احسن انداز میں انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا علمی فیض صرف تدریس کی حد تک نہیں بلکہ آپ

اپنے اصلاحی مواعظ کے ذریعے بھی اس امت کی ہدایت وراہنمائی کے لیے بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کا انداز بیان محققانہ اور عام فہم ہونے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اخلاص وللہیت کے جذبے سے سرشار آپ کی ہر بات ''از دل خیزد بردل ریزد'' کا عین مصدق ہوتی ہے۔

اس لیے ضروری تھا کہ آپ کے ان مواعظ کی خوب سے خوب تر اشاعت کی جائے تاکہ امت مسلمہ ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ اس ضرورت کے پیش نظر میں نے آپ کے مواعظ اور خطبات کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ جس پر خواص و عوام کی طرف سے بھرپور حوصلہ افزائی اور مقبولیت نظر آئی۔ اور اللہ کے فضل وکرم سے چھ جلدیں پایہ تکمیل تک پہنچ کر قارئین کی نظر ہو چکی ہیں۔ اور اب ساتویں جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ عزوجل اسکی مقبولیت میں اور اضافہ فرمائیں اور ان کو مخلوق کی ہدایت اور میری مغفرت کا ذریعہ بنائیں۔ آخر میں میں ان معاونین کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے قیمتی مصروفیات ترک کر کے میری راہنمائی فرمائی خصوصاً میرے تمام اساتذہ کرام جنہوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اللہ ان کو شایان شان جزاء عطا فرمائے۔

اور مولانا محمد عمران صاحب کا جنہوں نے ان خطبات کو کیسٹوں سے نقل کر کے ترتیب دے کر معنون کیا اور تخریج وتصحیح کر کے اس کو تیار کیا۔ آخر میں عزیزم برخوردار مولانا مفتی صہیب صاحب سلمہ کا تذکرہ کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جنہوں نے انتہائی دلچسپی سے کام لے کر اس کو کمپوزنگ اور چھپائی کے تمام مراحل سے گزار کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اللہ انکی عمر میں برکت دے۔

اور ہم سب کو اس کتاب سے استفادے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

ابوطلحہ ظفر اقبال غفرلہ

cer Demo

حقیقت لا الہ الا اللہ

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ " (سورہ انبیاء. آیت. ۲۵)

"وَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلّم مَنْ کَانَ آخِرُ کَلَامِہٖ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ " (ابوداؤد. ۲/۸۸. مشکوۃ. ۱/۱۴۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

آیات کا ترجمہ

سورہ انبیاء کی یہ ایک آیت آپ کے سامنے پڑھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ﴾

''سرور کائنات ﷺ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا''

﴿اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ﴾

مگر ہم اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے ہیں۔

﴿اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا﴾

''کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں''

اس میں اگرچہ ''ما'' نفی کا ہے۔ لیکن ''اِلَّا'' آکے اس نفی کو توڑ دیتا ہے۔ (آپ سمجھتے ہیں)۔ اب ہم سادے الفاظ میں اس کا مفہوم یوں بیان کریں گے۔ کہ ہم نے آپ سے پہلے جو نبی بھی بھیجا۔ ہر نبی کی طرف ہم نے یہی وحی کی۔ کہ میرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ پس تم میری عبادت کرو۔

حدیث کا ترجمہ:

اور جو حدیث شریف کا ٹکڑا میں نے آپ کے سامنے پڑھا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهٖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ))

اس دنیا سے جاتے وقت آخری آخری بات جس کی زبان پر یہ جاری ہوگئی۔

''لا الٰہ الا اللہ'' تو

''دَخَلَ الْجَنَّةَ''۔

وہ جنت میں جائے گا۔ (ابوداؤد۔ ۲/۸۸۔ مشکوۃ۔ ۱/۱۴۱)

توحید کی اہمیت:

ترجمے سے ہی آپ حضرات اس بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ کہ"لا الٰہ الا اللہ" جس کو آیت میں" لا إلٰہ الا أنا" کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ ہی ہے۔ تو اللہ کہتا ہے کہ میرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اور لا الہ الا اللہ کا بھی یہ معنی ہے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں۔

آدم سے لے کر آخری نبی سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ تک یہی عقیدہ تلقین کیا گیا۔

- ہر نبی پہ وحی یہی آئی۔
- ہر رسول پہ وحی یہی آئی۔
- اور ہر نبی کی تبلیغ کی ابتداء یہیں سے ہوئی۔

کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

ایک مسئلہ ہوتا ہے ایک مفتی کا لکھا ہوا۔ اسکی بھی اہمیت ہے۔ لیکن اگر اس مسئلے کے اوپر سارے ملک کے مفتیوں کے دستخط ہو جائیں۔ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ مسئلہ بہت ہی پکا ہو جاتا ہے۔ جس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن اگر ایک مسئلہ ایسا ہو کہ آدم علیہ السلام سے لے کے محمد رسول اللہ ﷺ تک ہر نبی، ہر رسول نے بیان کیا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہر نبی، ہر رسول کو یہ حکم ہوا ہو کہ اس بات کا اعلان کرو، لوگوں کو اسکی تلقین کرو۔ تو آپ اندازہ کیجئے کہ وہ بات کتنی پکی، کتنی ٹھوس، کتنی اہم، کتنی ضروری ہو جائے گی۔

اس لئے"لا الہ الا اللہ" یہ ہر دین کی بنیاد ہے۔ ہر دور میں دین کی بنیاد اسی کلمے سے ہی اٹھائی گئی۔ دوسرا جزء تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ہم پڑھتے ہیں" لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لیکن ہم سے پہلے، سرور کائنات ﷺ سے پہلے۔

- آدم علیہ السلام کے ماننے والے" لا الٰہ الا اللہ آدم صفی اللہ" کہتے تھے

- نوح علیہ السلام کے ماننے والے۔ "لا إلٰہ إلا اللہ نوح نجی اللہ" کہتے تھے۔
- ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے "لا إلٰہ إلا اللہ ابراہیم خلیل اللہ" کہتے تھے۔
- موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے۔ "لا إلٰہ إلا اللہ موسیٰ کلیم اللہ" کہتے تھے۔
- عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے۔ "لا إلٰہ إلا اللہ عیسیٰ روح اللہ" کہتے تھے۔

توہر نبی کے دور میں کلمے کا دوسرا جزء تو تبدیل ہوا ہے۔ لیکن پہلا جز کسی نبی کے دور میں تبدیل نہیں ہوا۔ ہر نبی کے دور میں کلمے کا پہلا جزء یہی رہا ہے۔ لا الٰہ لا اللہ

کلمے کی اہمیت پر واقعہ:

ان الفاظ کی عظمت کو جاننے کیلئے اس واقعہ کو جان لینا کافی ہے۔ جو حدیث شریف میں آتا ہے۔ اور فضائل ذکر، تبلیغی نصاب، میں آپ حضرات نے بھی پڑھا ہوگا، سنا ہوگا، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ "یا اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز بتادے جس کے ساتھ میں تجھے یاد کیا کروں" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "لا الٰہ الا اللہ" پڑھا کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے ذکر پوچھا تو اللہ نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو۔

تو موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ یا اللہ! یہ تو سارے ہی پڑھتے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی ایسا ذکر بتاؤ جو عام لوگوں کو معلوم نہ ہو۔ کوئی خاص چیز مجھے بتاؤ۔ اپنے یاد کرنے کی۔ یہ "لا الہ الا اللہ" تو سارے ہی پڑھتے ہیں۔

تو حدیث شریف میں ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ "اے موسیٰ! اگر ساتوں زمین، ساتوں آسمان ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں اور "لا الہ الا اللہ" ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے تو یہ "لا الہ الا اللہ" پوری کائنات پہ بھاری ہو جائے گا۔" (مشکوۃ ۲۰۱۔ شرح السنہ للبغوی ۲/۲۰۰۔ الادب المفرد للبخاری ۱/۱۹۲)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا سب سے اچھا طریقہ۔ "لا الٰہ الا اللہ" کا ذکر ہے۔

کلمے کی دو حیثیتیں

اب اس روایت سے ایک بات یہ معلوم ہو گئی۔ کہ لا الٰہ الا اللہ کی دو حیثیتیں ہیں۔

ایک اس کی حیثیت ہے۔ عقیدے کی۔ کہ یہ عقیدہ ہے اور اس عقیدے کو اختیار کرنے کے ساتھ ہم مسلمان ہوئے، مومن ہوئے۔ جب ہم نے زبان سے یہ کہد یا اور دل کے اوپر گانٹھ دے لی۔ عقیدہ گانٹھ دینے کو کہتے ہیں۔ یعنی دل میں یہ بات باندھ لی، جمالی۔ جیسے کسی چیز کے اوپر گانٹھ دی جاتی ہے۔ ''عقیدہ'' یہ ''عقدہ'' سے ہے بمعنی گرہ۔

تو عقیدہ بنا لینے کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے۔ دل میں اس طرح سے بات بٹھالی۔ جس طرح سے گانٹھ دی جاتی ہے۔ تو ''لا الہ الا اللہ'' عقیدہ بھی ہے۔ اس کے ایک دفعہ زبان سے اقرار کرنے کے بعد اور دل میں بٹھا لینے کے ساتھ آپ مومن ہو گئے۔ ایمان آ گیا۔ اس اعتبار سے تو یہ عقیدہ ہے۔

اور عقیدے کے اعتبار سے اس کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ پڑھنے کے ساتھ انسان مومن ہو جاتا ہے۔

اور ایک اسکی حیثیت ہے ذکر کی۔ ذکر جو ہے۔ اس میں ایک دفعہ پڑھنا نہیں۔ بلکہ جتنا آپ اس کا تکرار کرتے چلے جائیں گے، جتنی دفعہ دہراتے چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ سب سے اچھا طریقہ اللہ کو یاد کرنے کا اسی کلمے کا ورد ہے۔

اور اس کلمے کا جو دوسرا اجزء ہے ''محمد رسول اللہ'' یہ غالباً میں نے آپ کے سامنے پہلے بھی کسی بیان کے اندر ظاہر کیا تھا۔ کہ ''محمد رسول اللہ'' ذکر نہیں۔ یہ صرف عقیدہ ہے۔ اس لئے ذکر کے اندر اس کو بار بار نہیں دہرایا جاتا۔ وہ جو روایت آپ نے سنی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ستر ہزار دفعہ کلمہ پڑھ کر کسی کو ایصال ثواب کر دیا جائے تو وہ

بخشا جاتا ہے''

کلمے کے ذکر سے عذاب قبر دور ہو گیا:

یہ فضائل ذکر میں آپ نے پڑھا ہو گا۔ اس کتاب میں حضرت الشیخ (مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ) نے واقعہ بھی لکھا ہے کہ۔

ایک نوجوان تھا۔ کسی بزرگ نے دیکھا کہ وہ بیٹھا رو رہا ہے۔ پوچھا کیوں رو رہے ہو؟۔ تو اس نے کہا۔ مجھے کچھ انکشاف ہوا ہے۔ کہ میری والدہ کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ وہ بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے لیے ستر ہزار دفعہ یہ کلمہ پڑھا ہوا تھا۔ (جس کا مطلب ہے کہ آپ بھی اپنی آخرت کے ذخیرے کیلئے ستر ہزار دفعہ کلمہ پڑھ لیں۔ تو گویا کہ یہ بھی ایک ایسا عمل ہے کہ جس عمل کے اوپر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ تو آپ اپنی زندگی میں ستر ہزار دفعہ اس کو پڑھ لیں، ذخیرہ کر لیں)

وہ کہتا ہے میں نے چپکے سے، اس نوجوان کو بتائے بغیر ستر ہزار دفعہ کلمہ جو پڑھ کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسکی والدہ کو ایصال ثواب کر دیا۔ تو تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس نوجوان کو دیکھا کہ خوش ہے اور ہنس رہا ہے۔ جب اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اب میری ماں سے وہ عذاب ٹل گیا ہے۔

وہ بزرگ کہتے ہیں کہ مجھے اس سے دو باتوں کی صداقت معلوم ہوگئی۔

- ایک تو اس نوجوان کے کشف کے صحیح ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ کہ واقعی اس نوجوان کا کشف صحیح تھا۔ کہ پہلے اس کو منکشف ہوا کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ اور اس کو نہیں معلوم کہ میں نے ستر ہزار دفعہ پڑھا ہوا کلمہ اس کو بخشا ہے۔ جب بخشا تو پھر اس نے کہا کہ اب عذاب ٹل گیا ہے۔ تو ایک تو اس کے کشف صحت کا مجھے یقین ہو گیا۔
- دوسرے اس روایت کی صداقت پر بھی اعتماد آ گیا۔ کیونکہ بسا اوقات کوئی

روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ محدثین اس کو قابل اعتبار نہیں ٹھہراتے ہیں۔ اور فضائل کی اکثر و بیشتر روایتیں سند کے اعتبار سے کچھ کمزور ہی ہوتی ہیں۔ تو اس واقعہ سے مجھے یقین آ گیا کہ یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ کہ ستر ہزار دفعہ کلمہ پڑھ کر اگر ایصال ثواب کر دیا جائے۔ تو انسان بخشا جاتا ہے۔

تو وہاں جو ستر ہزار دفعہ پڑھنا ہے۔ وہ صرف ''لا الہ الا اللہ'' ہے۔ ''محمد رسول اللہ'' ویسے برکت کے طور پر کبھی کبھی زبان سے جاری کر لیں۔ لیکن جہاں ذکر کی بات آتی ہے۔ جیسے مسجدوں پر لکھا ہوتا ہے۔

﴿اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾

یہ محمد رسول اللہ کا اضافہ اپنی جانب سے ہے۔ روایت میں ایسا نہیں ہے۔

(ترمذی ۲/۱۷۵۔ مشکوۃ ص ۲۰۱)

صرف ''لا الٰہ الا اللہ'' یہی الفاظ ہیں۔ جو بطور ذکر کے پڑھے جاتے ہیں۔ تو ایک حیثیت تو اس کی ذکر کی ہے۔ کہ اس کو جتنا چاہیں پڑھیں۔ اس لئے آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہمارے سلسلے میں جو نفی اثبات کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے۔ کیونکہ اس کا پہلا جزء ''لا الٰہ'' نفی پر مشتمل ہے۔ کہ کوئی معبود نہیں۔ اور ''الا اللہ'' یعنی سوائے اللہ کے۔ یہ اثبات ہے۔ تو نفی اثبات کے ذکر سے یہی مراد ہے کہ باقی سب کی نفی۔ ایک اللہ کا اثبات۔ تو اسی کی کثرت کی تلقین کی جاتی ہے۔ اگرچہ پڑھنے کے انداز ہر ایک کے مختلف ہیں۔ سلسلوں میں۔

بہرحال تصوف کے تمام سلسلوں میں بنیادی طور پر ذکر ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ہی ہے۔ اسم ذات کا بھی ہے یعنی صرف ''اللہ۔۔ اللہ''۔ اور نفی اثبات کا بھی ہے۔

یہ تو خیر جس وقت آپ ذکر کرنا چاہیں گے۔ پوچھیں گے۔ کوئی آپ کو بتائے گا۔ آپ اس کی تسبیحات پڑھیں گے۔ یہ تو حیثیت اسکی ذکر کی ہے۔ تو آپ اپنے طور پر اگر چاہیں تو ستر ہزار دفعہ پڑھ کے

- اپنے لیے ذخیرہ کرلیں۔
- اپنے والدین کو ایصال ثواب کریں۔
- اپنے بزرگوں کو ایصال ثواب کریں۔
- اپنے اساتذہ کو ایصال ثواب کریں۔
- اپنے دوستوں کو ایصال ثواب کریں۔
- اپنے رشتہ داروں کو ایصال ثواب کریں۔

یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے مرنے والوں کیلئے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو انسان اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ وہ ایسے ہوتا ہے۔ جیسے ڈوبا ہوا انسان ایک ایک تنکے کا سہارا طلب کرتا ہے۔ وہ منتظر رہتے ہیں کہ

- ہمارے لیے کوئی دعا کرے۔
- ہمارے لیے کوئی استغفار کرے۔
- ہمارے لیے کوئی ایصال ثواب کرے۔

تو اس سے مرنے والوں کی روح بہت خوش ہوتی ہے۔

(مشکوۃ ۲۰۶۔ شعب الایمان ۱۶/۲۲۳، ۱۹/۲۸۸)

ہمارا اہل السنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے۔ اور علماء دیوبند میں سے ہر ایک یہی بیان کرتا ہے۔ کہ ایصال ثواب برحق ہے۔ اور ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ جو چیز میت کے نام پر دی جائے۔ وہ بعینہ نہیں پہنچتی

آپ نے جوتا دیا تو آپ کہیں کہ فرشتے وہ جوتا قبر میں پہنچادیں گے اور مردے کو وہ جوتا پہنادیں گے۔ ایسی بات نہیں ہے۔

آپ نے کپڑا دیا تو آپ کہیں کہ کپڑا لے کے فرشتے مردے کے پاس جائیں گے.........نہیں......

- جس کو جنت کا حلہ (جوڑا) مل گیا۔

- جس کو جنت کی خوشبوئیں مل گئیں۔
- جس کو جنت کی غذائیں مل گئیں۔
- جس کو جنت کی راحت مل گئی۔
- جس کو جنت کی نہریں مل گئیں۔
- جس کو جنت کا بستر مل گیا۔

وہ آپ کی ان دنیا کی چیزوں کو کیا کرے گا؟۔ تو یہ چیز نہیں جاتی۔ ہاں.... اللہ تعالیٰ اس کو اس کا اجر آخرت کی نعمتوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس لئے آپ جو بھی دے دیں۔ اس کا ثواب اگر مرنے والے کو پہنچانا چاہیں گے۔ تو ثواب پہنچ جائے گا۔ اور اسی طرح سے کلمے کا ثواب بھی پہنچتا ہے۔

عبادت کی حقیقت:

اور ''لا الہ الا اللہ'' کی ایک حیثیت عقیدے کی ہے۔ عقیدے کی حیثیت سے اس کا مفہوم یہ ہوا۔ کہ اس کائنات میں معبود اللہ کے بغیر کوئی نہیں۔ یہ ہے اس کا معنی۔

اب اگر آپ اس کی تفسیر صحیح طور پر سمجھنا چاہیں۔ تو سمجھنا پڑتا ہے کہ معبود کسے کہتے ہیں؟۔ معبود کا مفہوم صحیح سمجھ میں آئے گا۔ تو کلمے کا مفہوم بھی سمجھ میں آئے گا۔ کہ معبود کون ہوتا ہے؟۔ تو یہ ایک موٹی سی بات آپ کی خدمت میں عرض کر دوں۔ معبود یہ اسم مفعول ہے۔ جس کا معنی ہے عبادت کیا ہوا، جس کی عبادت کی جائے۔ اس کو معبود کہتے ہیں۔

لیکن پھر عبادت کسے کہتے ہیں؟۔ اب عبادت کا پتہ چلے گا تو معلوم ہوگا کہ ہم جو عبادت کر رہے ہیں۔ یہ کس کی ہے؟۔ اللہ کی ہے یا غیر کی ہے؟۔ تو اس کلمے کے مفہوم کو سمجھنے کا دارومدار اس بات پر آگیا۔ کہ آپ عبادت کے مفہوم کو سمجھیں کہ عبادت کسے کہتے ہیں۔ تو جب تک آپ عبادت کے مفہوم کو نہیں سمجھیں گے۔ اس وقت تک آپ کو کلمے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ عبادت کیا چیز ہے؟۔ عبادت مصدر ہے۔ جس کا معنی ہے "بندہ بننا"۔ اللہ نے ہمیں اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا یعنی اس لئے پیدا کیا کہ ہم اللہ کے بندے بن کے رہیں۔ اس کا لفظی مفہوم یہی ہے۔

لیکن بندہ بننے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟۔ یہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں۔ جو آپ کتاب العتق پڑھتے ہیں۔ جس میں غلام اور بندے کے احکام مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو سمجھانے کیلئے یہ غلامی والا سلسلہ جاری کیا۔ تو اس سلسلے سے یہ بات سمجھائی جا سکتی ہے۔ شرعی طور پر جس کو "عبد" کہتے ہیں اور اس کی نسبت آپ کی طرف بھی ہوتی ہے کہ یہ فلاں کا عبد ہے۔ عبد کے احکام کیا ہیں؟۔ تو آپ کی فقہ میں اس سلسلے میں بڑے بڑے باب ہیں۔ لیکن خلاصہ سب کا یہ ہے۔ کہ عبد بے اختیار ہوتا ہے۔ جو ایک دفعہ کسی کا عبد بن گیا اس کے اختیارات سلب ہو گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ

- عبد کچھ بیچ نہیں سکتا..... مولیٰ (آقا) کی اجازت کے بغیر۔
- عبد کچھ خرید نہیں سکتا..... مولیٰ کی اجازت کے بغیر۔
- عبد نکاح نہیں کر سکتا..... مولیٰ کی اجازت کے بغیر۔
- عبد کوئی معاملہ نہیں کر سکتا..... مولیٰ کی اجازت کے بغیر۔
- عبد کوئی تصرف نہیں کر سکتا..... مولیٰ کی اجازت کے بغیر۔
- عبد جب تک عبد ہے..... اسکی ملکیت میں کچھ نہیں آتا۔ وہ کسی چیز کا مالک بن ہی نہیں سکتا۔

اس کے سارے کے سارے اختیارات مولیٰ کے پاس ہوتے ہیں۔ عبد کا اپنا اختیار کچھ نہیں آتا۔ تو اللہ کا عبد ہونے کا معنی یہ ہے کہ انتہائی عظمت اللہ کیلئے قرار دے کر پھر ہم اپنے آپ کو یہ سمجھیں کہ ہم اس کے سامنے بالکل دبے ہوئے ہیں۔

- جو کچھ ہمیں مل سکتا ہے۔ وہاں سے مل سکتا ہے۔
- جو ہمیں تکلیف پہنچے گی..... وہیں سے پہنچے گی۔

- جو ہمیں راحت پہنچے گی.... وہیں سے پہنچے گی۔
- جو ہمیں خوشی پہنچے گی.... وہیں سے پہنچے گی۔
- جو ہمیں غمی پہنچے گی........ وہیں سے پہنچے گی۔
- جو ہمیں عزت ملے گی.... وہیں سے ملے گی۔

اپنے آپ کو اس کے سامنے دبا ہوا سمجھ لیں۔ یہ ہے اللہ کے سامنے عبدیت۔ تو "لا الہ الا اللہ" کا مفہوم یہ ہوا کہ کائنات میں ہمارے عقیدے کے مطابق انتہائی عظمت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اور اللہ کے علاوہ انتہائی عظمت کسی کو حاصل نہیں۔ اور پوری کی پوری کائنات میں سے ہم صرف اللہ کے سامنے بے بس ہیں اور اللہ کے علاوہ ہم کسی دوسرے کے سامنے بے بس نہیں ہیں۔ یہ ہے اس عقیدے کا حاصل۔

کلمہ پڑھنے پر ذمہ داریاں:

اس عقیدے نے آ کے کیا اثرات پیدا کیے؟۔ اور اس نے ہمارے اوپر کیا ذمہ داریاں ڈالیں؟۔ یہ دو باتیں سوچنے کی ہیں۔

اس عقیدے نے ہمارے اوپر ذمہ داریاں کیا ڈالیں۔ اسی بات کو دیکھتے ہوئے۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

اگر گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا اِلٰہ را

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ "میں جب اپنے آپ کو اپنی زبان سے کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ تو کانپ جاتا ہوں، ڈر جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ مسلمان نے جو "لا الہ الا اللہ" کا اقرار کیا ہوا ہے۔ اس کی کیا مشکلات ہیں۔ جب ان مشکلات کا احساس کرتا ہوں تو میں کانپ جاتا ہوں"۔

یعنی انسان کے اوپر "لا الہ الا اللہ" اتنی ذمہ داریاں ڈالتا ہے۔ کہ جب ان کا تصور کرتا ہوں۔ تو میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوا ڈرتا ہوں۔

یہ ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ کہ "لا الٰہ الا اللہ" کہنے سے ہم پر کیا ذمہ داریاں آئیں اور اس نے کیا اثرات مرتب کیے؟۔ دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالیں تو مختصر سی بات آپ کے سامنے یہ آجائے گی۔ ذمہ داریاں یہ ہیں کہ جس وقت آپ نے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھ لیا تو گویا کہ آپنے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے بے اختیار کر دیا۔ اب نہ حلال، نہ حرام، نہ پینا، نہ کھانا، کچھ بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔ یہ ذمہ داری ہے۔ جو آپ نے قبول کر لی۔ اس قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے عہد کر لیا کہ "اے اللہ! واقعی تو بڑا ہے اور ہم چھوٹے ہیں۔ اور واقعی تو با اختیار ہے اور ہم بے اختیار ہیں۔ جو تو ہمیں اختیار دے گا تو ہم کریں گے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں کریں گے"

اب آپ اندازہ کریں کہ کتنی بڑی ذمہ داری آگئی۔ اس لئے یہ کلمہ پورے دین کو قبول کرنے کا عنوان ہے۔ کہ جب آپ نے یہ کلمہ پڑھ لیا۔ یوں سمجھو کہ سارا دین قبول کر لیا۔

سمجھانے کیلئے ایک مثال:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو سمجھانے کیلئے یہ مثال دی ہے۔ بڑی سادی سی مثال ہے۔ کہ جس طرح سے ہمارے ہاں نکاح ہوتا ہے۔ نکاح میں کیا ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے میں نے نکاح کیا اور دوسرا کہتا ہے میں نے قبول کر لیا۔ یہ دو ہی لفظ بولے جاتے ہیں "نَكَحْتُ"..... قَبِلْتُ۔ انہیں سے نکاح ہو گیا اور شرعی نقطہ نظر سے تو آپ جانتے ہیں کہ نہ مولوی کا ہونا ضروری ہے اور یہ جو طوفان شادی کے موقع پر برپا ہوتا ہے۔ نہ یہ ضروری۔ جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ قیامتِ کبریٰ سے تعبیر کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ "منگنی قیامت صغریٰ ہے۔ اور شادی قیامتِ کبریٰ ہے۔"

کہ منگنی سے ہی تباہی آنی شروع ہوتی ہے۔ زندگی بھر کی کمائی لوگ خراب کرنا شروع کرتے ہیں۔ وقت ضائع کرتے ہیں۔ پھر شادی پر تو قیامت کبریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اور یہ ساری لایعنی رسمیں، ساری لایعنی باتیں، اپنے اوپر جو مسلط کر رکھی ہیں ہم

نے۔ یہ ساری کی ساری اپنی بنائی ہوئی ہیں۔ یاد رکھیے! نکاح میں

- نہ منگنی ضروری ہے۔
- نہ بارات ضروری ہے۔
- نہ ڈھول ڈھمکا ضروری ہے۔
- نہ شور شرابا ضروری ہے۔

بلکہ ایک سادی مجلس کے اندر لڑکی کا متولی کہتا ہے میں نے نکاح کر دیا۔ لڑکا بالغ ہے تو کہتا ہے میں نے قبول کر لیا، نکاح ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس مجلس کے اندر مہر کا تذکرہ بھی ضروری نہیں۔ اگرچہ مہر ہے ضروری لیکن تذکرہ ضروری نہیں۔ آپس میں طے کر لو۔ وہ بھی کتنا سا ہے؟۔ کم از کم دس درہم ہے۔ اور یہ تین، ساڑھے تین تولے چاندی بنتی ہے۔ بس یہی مہر ہے۔ باقی کوئی چیز ضروری نہیں۔

لیکن یہ ایک لفظ ہے جس کے ساتھ زوجین جکڑے گئے۔ کتنی ساری ذمہ داریاں آگئیں۔

اب اگر لڑکی اپنے شوہر سے کہے کہ مجھے کپڑے لا کے دے۔ وہ کہے کہ میں نے تجھے قبول کیا ہے۔ کپڑے لانے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ کپڑے بھی لا کے دوں گا۔

لڑکی کہتی ہے کہ کھانے کیلئے روٹی چاہیے۔ کہتا ہے کہ میں نے تو وعدہ نہیں کیا تھا کہ روٹی دوں گا۔

رہائش کیلئے مکان چاہیے۔ وہ کہتا ہے میں نے اس کا تو وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں نے تو تجھے قبول کیا تھا۔ باقی تو کوئی ذمہ داری میں نے نہیں لی۔

تو آپ جانتے ہیں کہ اگر اس قسم کی بات سامنے آجائے تو آپ یہ کہیں گے کہ اس پاگل کو پتہ ہی نہیں کہ نکاح ہوتا کیا ہے؟۔ ارے! قبلتُ کے اندر تو تو نے سب کچھ قبول کر لیا۔ جب تو نے لڑکی کو قبول کیا تو

- اس کو رہائش بھی دینی پڑے گی۔

- اس کو لباس بھی دینا پڑے گا۔
- اس کو خوراک بھی دینی پڑے گی۔

یہ کتنا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ کہ ساری کی ساری ذمہ داریاں آپ کے سر پہ آگئیں۔

بالکل اسی طرح یہ جو آتا ہے کہ "لا الہ الا اللہ" پڑھنے سے جنت میں چلے جاؤ گے۔ تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی زبان سے صرف یہی چار لفظ ہی ادا کریں تو آپ جنتی ہو گئے۔ پھر آپ سے کوئی کہے۔

- نماز پڑھو!...... آپ کہیں۔ اس کا تو ہم نے وعدہ نہیں کیا۔
- روزہ رکھو!...... آپ کہیں۔ اس کا تو ہم نے وعدہ نہیں کیا۔
- زکوٰۃ ادا کرو!...... آپ کہیں۔ اس کا تو ہم نے وعدہ نہیں کیا۔
- حج ادا کرو...... آپ کہیں۔ اس کا تو ہم نے وعدہ نہیں کیا۔

نہیں...... بلکہ جب "لا الہ الا اللہ" پڑھ لیا۔ تو آپ نے پورے کا پورا دین قبول کر کے اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا عہد کر لیا۔ اب اگر اللہ کے حکموں کی خلاف ورزی کرو گے تو بدعہدی کرو گے۔ اس لئے احکام الٰہیہ کے خلاف چلنا ٹھیک نہیں ہے۔ تو ذمہ داریاں تو یہ آگئیں۔ کہ اللہ کے سارے احکام ہم نے قبول کر لیے اور ان کے مطابق چلنے کا ہم نے عہد کر لیا۔

کلمے نے کیا اثرات پیدا کیے؟

اور اس کے آثار کیا ہیں؟۔ تو آثار اس کلمے کے یہ ہیں۔ کہ ساری کائنات کا خوف دل سے نکل گیا۔ اب

- نہ مشرکوں کی طرح سورج کو سجدہ کرنے کی ضرورت۔
- نہ مشرکوں کی طرح چاند کو سجدہ کرنے کی ضرورت۔
- نہ مشرکوں کی طرح آگ کی پوجا کرنے کی ضرورت۔

- نہ مشرکوں کی طرح پانی کے سامنے جھکنے کی ضرورت۔
- نہ مشرکوں کی طرح بتوں کے سامنے جھکنے کی ضرورت۔
- نہ مشرکوں کی طرح پتھروں کے سامنے جھکنے کی ضرورت۔
- نہ مشرکوں کی طرح درختوں کے سامنے جھکنے کی ضرورت۔
- نہ مشرکوں کی طرح جنوں کے سامنے جھکنے کی ضرورت۔

بت، آگ، پانی تو بہت دور کی بات ہے۔ کائنات کے اندر بڑی سے بڑی چیز جو بظاہر دیکھنے میں نظر آتی ہے۔ کسی چیز کی عظمت بھی انسان کے دل میں نہیں بیٹھتی۔ انسان کہتا ہے۔

سورج بھی ہمارے اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور ہمارا خادم ہے۔ ہم اس کے سامنے کیوں جھکیں؟۔ یہ تو اللہ نے پیدا ہی ہمارے لیے کیا ہے۔ چاند کے سامنے ہم کیوں جھکیں؟۔ یہ تو اللہ نے پیدا ہی ہمارے لیے کیا ہے۔

یہ لکڑی، پتھر، پیتل، تانبا، جو کچھ ہے۔ سب کو اللہ نے ہماری خدمت کیلئے پیدا کیا ہے۔ اب مٹی کی کوئی چیز بنالی۔ پیتل کی کوئی چیز بنالی، تانبے کی کوئی چیز بنالی، اب ان کے سامنے جھکنا شروع ہو جائیں۔ یہ تو انسانیت کی توہین ہے۔

تو پوری کائنات کا خوف انسان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ جب انسان اپنے دل کو اللہ کے ساتھ جوڑ لیتا ہے۔ اور پھر انسان سوچتا ہے کہ بنانا، بگاڑنا، سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی دوسرا کچھ نہیں کر سکتا۔

نفع نقصان کا مالک صرف اللہ:

انہی الفاظ کے ساتھ آپ ﷺ نے حضرت ابن عباس کو تلقین کی تھی۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔

((یا غُلَامُ! اِحْفَظِ اللّٰہَ یَحْفَظْکَ))

''اللہ کا دھیان رکھا کر۔ اللہ تیرا دھیان رکھے گا'' ۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ

وَاعْلَمْ .... اس بات پر یقین کرلے کہ

"اگر سارے کے سارے انسان اکٹھے ہو جائیں اس بات پر کہ تجھے کوئی نقصان پہنچادیں۔ تو تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ کو منظور ہو۔ اور اگر سارے کے سارے اکٹھے ہو کے تجھے کوئی نفع پہنچانے پہ آجائیں تو تجھے نفع نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ کو منظور ہو۔ (مشکوۃ ص ۴۵۳ ج ۱۔ ترمذی۔ ۲/۷۸)

- ❀ نفع بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔
- ❀ نقصان بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔
- ❀ نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔
- ❀ نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

تو پھر ان چیزوں سے ڈرنے کی ضرورت کیا ہے؟۔ کوئی آدمی جب ان چیزوں کے سامنے آکے جھکتا ہے تو دو باتوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے جھکتا ہے۔ یا نفع حاصل کرنے کے لیے۔ یا نقصان سے بچنے کیلئے۔

اسی لیے قرآن کریم میں جہاں بھی رد شرک آیا ہے۔ وہاں یہی ہے کہ تم ایسی چیزوں کو پوجتے ہو۔

" لَا يَنفَعُكُم شيئاً وَلَا يَضُرُّكُم " (سورہ انبیاء۔ آیت ۶۶)

"جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتی ہیں۔ نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔"

تو جب نفع، نقصان کا اختیار ہم نے اللہ کیلئے مان لیا۔ تو اب مخلوق کے سامنے جھکنے کی، مخلوق کے سامنے دبنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

اس لئے جو موحد ہوتا ہے۔ وہ مخلوق سے بے خوف ہوتا ہے۔ مخلوق سے طمع نہیں رکھتا۔ مخلوق سے حرص نہیں رکھتا۔ مخلوق سے خوف نہیں رکھتا۔ اس کا دل اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔

موحد کی شان بزبان سعدی:

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے۔

موحد چہ بر پائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس
بریں است بنیادِ توحید و بس

کہتے ہیں۔کہ "موحد کا یہ حال ہے کہ اگر اس کے سامنے سونے کے ڈھیر لگا دو۔ اور اسے کہو کہ اپنا یہ عقیدہ چھوڑ دے۔ یا اس کے سر کے اوپر تم ہندی تلوار لے کے کھڑے ہو جاؤ۔ (پرانے زمانے میں ہندی تلواریں بہت مشہور ہوا کرتی تھیں) تو چاہے ہندی تلوار لے کر اس کے سر کے اوپر کھڑے ہو جاؤ۔ نہ اس کو کسی سے امید ہوتی ہے۔ نہ کسی سے خوف ہوتا ہے۔توحید کی بنیاد اسی بات پہ ہے۔"

یہ ہم جو ٹکے ٹکے کے پیچھے پھسلنے لگ جاتے ہیں۔اور غیر اللہ کے پیچھے اپنا ایمان بیچنے لگ جاتے ہیں۔ دیانت نہیں رہتی، امانت نہیں رہتی۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں پتہ نہیں کہ توحید کا عقیدہ ہمیں کیا سکھاتا ہے؟۔کیا نہیں سکھاتا؟۔

ہمارے ایمان کی حالت:

اس لیے ہم اپنے آپ کو بے حقیقت ثابت کرتے ہیں جب ہمارا یہ حال ہوتا ہے

- ۱۰ روپے کے پیچھے جھوٹی قسم اٹھوالو۔
- ۱۰۰ روپے کے پیچھے قرآن سر پہ اٹھوالو۔
- ۱۰۰۰ روپے کے پیچھے منہ سے کچھ کا کچھ نکلوالو۔

ذرا سا حرص، لالچ دے کے جو بد اخلاقی چاہو کر والو۔ چوری کروالو، ڈاکہ ڈلوالو۔ یہ جو ہم اس طرح سے بکتے پھرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرتے ہیں۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زبان پر تو "لا الٰہ الا اللہ" ہے لیکن ہمارے دل

میں یہ کلمہ نہیں آیا۔ اگر یہ دل میں آیا ہوا ہوتا تو پھر ہماری حیثیت یہ نہ ہوتی۔ بلکہ ہم اپنے موقف پر پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہوتے۔ آندھیاں آتیں، طوفان آتے، ہمیں اپنے موقف سے ہلا نہ سکتے۔ نہ کسی طمع میں آکر اپنے موقف سے ہٹتے۔ نہ کسی خوف میں آکر موقف سے ہلتے۔ یہ ہے اصل کے اعتبار سے توحید۔ اور یہی ہر نبی نے سبق پڑھایا۔ اور جس نے صحیح طور پر توحید کا سبق پڑھ لیا۔ وہ پوری کائنات پہ بھاری ہو گیا۔

اس لئے یہ عقیدہ بہت اہم ہے۔ میں نے یہ آپ کے سامنے اختصاراً ذکر کیا۔ اس کے خلاف ہے شرک، اور آئندہ ان شاء اللہ العزیز ان مضامین کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ کہ توحید پھر اس کے مقابلے میں شرک کا ذکر کر کے پھر رسالت کا ذکر کریں گے۔ اور پھر سیرت کے متعلق کچھ آپ کے سامنے عرض کریں گے۔ آج تو اسی پر ہی اکتفاء کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

سوال: عرض ہے کہ ''رکن الدین'' ایک کتاب ہے جس میں مختلف مہینوں کے اعتبار سے مختلف نوافل کی تلقین کی گئی ہے۔ کہ فلاں مہینے میں فلاں طریقے سے نوافل پڑھیں۔ اس میں اتنی بار قل شریف پڑھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ درست ہے یا نہیں؟۔

جواب: یہ کسی کا عملیات کے درجے میں تجربہ ہو تو میں انکار نہیں کرتا۔ باقی یہ شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ شریعت میں نفل پڑھنے کا طریقہ وہی ہے۔ جیسے عام طور پر پڑھے جاتے ہیں۔ کوئی تاریخ کی خصوصیت نہیں، کوئی مہینے کی خصوصیت نہیں، کوئی طریقے کا فرق نہیں۔

آپ چاہیں تو ایک رات میں دو نفلوں میں پورا قرآن پڑھ لیں۔ آپ کو اجازت ہے۔ ممانعت نہیں ہے۔ لیکن یہ عقیدہ کہ فلاں تاریخ میں دو نفل پڑھنے

ہیں۔ اتنی دفعہ یہ سورۃ پڑھنی ہے۔ اس کے اوپر یہ نتیجہ نکلے گا۔ یہ یاروں کی خود ساختہ باتیں ہیں۔ اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

باقی ''رکن الدین'' کوئی معتبر کتاب نہیں۔ میں نے وہ کتاب دیکھی ہوئی ہے۔

سوال: السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ آج کل جو الیکشن ہو رہا ہے۔ اس میں ووٹ دینا کیسا ہے؟۔ اگر ہم اس کو غلط کہیں تو علماء بھی الیکشن لڑ رہے ہیں۔ تفصیل سے آگاہ کریں۔

جواب: میں اس میدان کا آدمی نہیں ہوں۔

سوال: السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں پرچہ دینے کیلئے تیار ہوتا ہوں تو جو کچھ یاد ہوتا ہے وہ بھی بھول جاتا ہے۔ کوئی وظیفہ بتائیں۔ جس سے پرچہ دینے میں آسانی ہو جائے۔

جواب: امتحان میں کامیاب انسان اپنی محنت سے ہوا کرتا ہے۔ وظیفوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ ویسے دل کی مضبوطی کیلئے کوئی وظیفہ پوچھنا ہو تو علیحدگی میں پوچھ لینا۔

سوال: استاجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ جو چیز پڑھوں یاد ہو جائے۔

جواب: اگر ایسا کوئی وظیفہ مجھے آتا ہوتا تو میں قرآن کریم کا حافظ ہو چکا ہوتا۔ لیکن میں قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ تلاوت کرتا ہوں پھر بھی حافظ نہیں ہوں۔ تو مجھے ایسا وظیفہ کوئی معلوم نہیں کہ جو آپ پڑھتے چلے جائیں وہ زبانی یاد ہوتا چلا جائے۔ ورنہ ساری مشکوٰۃ مجھے زبانی یاد ہو جاتی۔ میں چالیس دفعہ پڑھا چکا ہوں۔ لیکن ابھی تک یاد نہیں ہوئی۔

اس میں جتنی محنت کرو گے اتنا فائدہ ہوگا۔ تو خوب محنت کرو۔ باقی ان وظیفوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اصل حافظے کی چیز یکسوئی ہے (یہ میں آپ کے سامنے ایک دفعہ وضاحت کر چکا ہوں) اللہ نے آپ کو جو دماغ اور دل دیا ہے اس کا حجم بہت چھوٹا ہے۔ پھر اس میں اللہ نے آپ کے لیے بہت گنجائش

رکھی۔ لیکن اتنی نہیں جتنی آپ نکالنا چاہتے ہیں۔

- آپ چاہتے ہیں کہ ہمیں سبق بھی یاد ہوں۔
- آپ چاہتے ہیں کہ ہمیں ہر روز سیاسی بیان بھی یاد ہوں۔
- آپ چاہتے ہیں کہ ہمیں ناول بھی یاد ہوں۔
- آپ چاہتے ہیں کہ ہمیں میچ کی اصطلاحات بھی یاد ہوں۔

کرکٹ کی ساری معلومات ہوں، سیاسی لیڈروں کی تقریریں یاد ہوں، انکے نام یاد ہوں، ان کے کام یاد ہوں، تو دماغ میں اللہ نے اتنی گنجائش نہیں رکھی، تو ان کاموں کو چھوڑ دو اور صرف علم کیلئے اپنے دل، دماغ کو فارغ کر دو۔

آپ اس وقت بیٹھ کے سوچیں۔ بچپن کی باتیں آپ کو یاد ہیں۔ جب آپ تین چار سال کے ہوتے تھے اس وقت کے قصے آپ کو یاد ہیں۔ کہ ہم نے یہ کیا تھا۔ یہ کیا تھا۔ یہ بچپن کے قصوں کا یاد ہونا علامت ہے کہ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ ورنہ بھولنی ہوتی تو بیس بیس سال پہلے کی بات بھی بھول جاتی۔ وہ تو آپ نہیں بھولتے بلکہ وہ آپ کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے۔ کیوں محفوظ ہے؟۔ اس لیے محفوظ ہے کہ یہ اس وقت آپ کے ذہن میں بیٹھی ہوئی ہے۔ جب آپ خالی الذہن تھے۔ اور اب چونکہ دماغ میں انتہائی انتشار آگیا۔ ساری دنیا تو دماغ میں گھسیٹ رکھی ہے۔ تو علمی باتیں تمہیں کہاں سے آئیں۔

اس لیے

- جو طالب علم اخبار پڑھتا ہے۔
- جو طالب علم ڈائجسٹ پڑھتا ہے۔
- جو طالب علم میچ دیکھتا ہے۔
- جو طالب علم جلسے جلوسوں میں کثرت سے جاتا ہے۔

سوال نہیں پیدا ہوتا کہ اس کے دل، دماغ میں علمی باتیں محفوظ رہ جائیں۔ لازما

اس کے علم کے اندر خلل آئے گا۔ اور علم کو محفوظ کرنا چاہتے ہو تو ان سب خرافات کو چھوڑ دو۔ اور صرف اپنے سبق کو یاد کرو۔ پھر دیکھو کہ یاد ہوتا ہے یا نہیں؟

ورنہ آپ کو یہ بچپن کے قصے کیسے یاد ہیں؟ ناول ایک دفعہ پڑھ کر ساری حکایت یاد ہو جاتی ہے اور سبق ایک صفحہ یاد نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح جلسے جلوس دیکھ کے آئیں تو سارے مقررین کی تقریریں یاد ہوتی ہیں۔ کہ فلاں نے یوں کہا۔ فلاں نے یوں کہا۔ لیکن استاد کی تقریر یاد نہیں ہوتی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ توجہ نہیں۔ ان خرافات کے ساتھ دماغ بھر چکا ہے۔ تو جو طالب علم چاہتا ہے کہ میرے اندر علم پیدا ہو تو اس کو اپنے اندر یکسوئی پیدا کرنی چاہیے۔ بغیر یکسوئی کے اس کو محفوظ رکھنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ بغیر یکسوئی کے علم محفوظ نہیں ہوا کرتا۔

سوال: عرض یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔ اور جو لوگ اس میں ملازم ہیں ان کیلئے تنخواہ لینا کیسا ہے؟۔

جواب: برتھ کنٹرول اسے کہتے ہیں کہ بچے پیدا نہ ہوں۔ یہ مجبوری کے تحت، طبی نقطہ نظر سے۔ اسکی شریعت نے اجازت دی ہے۔ جیسے کوئی عورت ایسی بیمار ہو کہ اگر حمل ٹھہر جائے تو اس کی موت کا خطرہ ہے۔ تو وہ ایسی دوا استعمال کر سکتی ہے۔ ایسی تدبیر اختیار کر سکتی ہے کہ اولاد نہ ہو۔ عسرِ ولادت ہے کہ بچہ تنگی سے پیدا ہوتا ہے، آپریشن سے پیدا ہوتا ہے۔ جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ تو اس میں اجازت ہے کہ ایسی تدبیر اختیار کر لو کہ اولاد نہ ہو۔

لیکن یہ ہیں شخصی فیصلے۔ اس کو ایک قومی تحریک بنا دینا اور قومی تحریک بنانے کے ساتھ ساتھ بنیاد اس بات پہ رکھنا کہ رزق میں تنگی آرہی ہے۔ اگر تعداد بڑھ گئی تو کھائیں گے کہاں سے؟۔ یہ مشرکانہ نظریہ ہے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے۔ کہ مشرک اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہاں

برتھ کنٹرول کی گولیاں تو تھیں نہیں۔ جن کے ذریعے بچوں کو پیدا ہونے سے روک دیتے۔ اس لیے پیدا ہونے کے بعد قتل کر دیتے۔

قرآن نے دو نظریے بتائے ہیں۔ جن کے تحت وہ قتل کرتے تھے۔

"مِن اِملَاقٍ... مِن خَشیَۃِ املاق" (سورہ انعام آیت ۱۵۱۔ سورہ اسراء آیت ۳۱)

من املاق کا معنی ہے۔ کہ وہ سوچتے ہیں کہ ہم تنگ دست ہیں۔ ہمیں اپنے کھانے کو نہیں ملتا۔ اس بچے کو کہاں سے کھلائیں گے۔ اس لئے پیدا ہونے کے بعد گلا گھونٹ دیتے۔ ایک تو یہ ہے اور ایک ہے مِن خَشیَۃِ اِملَاقٍ ---کہ ماں، باپ تو خوشحال ہیں۔ ان کو تو کھانے مل رہا ہے۔ اب وہ بیٹھ کے حساب لگاتے ہیں کہ اتنی سی آمدنی میں دو بچے اور ماں اور باپ چار افراد کا گذارہ ہو سکتا ہے۔

پانچویں کا گذارہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر پانچواں پیدا ہو جاتا تو اس کا گلا گھونٹ دیتے۔ یہ "مِن خَشیَۃِ اِملَاق" ہے۔ یعنی تنگدستی کا اندیشہ ہے۔

یہ دونوں نظیرے مشرکانہ ہیں۔ ان کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رزق کی ذمہ داری خود لی ہے۔ تم پر نہیں ڈالی۔ اللہ خالق بھی ہے۔ اللہ رازق بھی ہے۔

تو خالق اور رازق ایک ہی ذات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کاموں میں بے ترتیبی، نشیب و فراز، عدمِ مناسبت، عدمِ موازنت، بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک عیب ہے کہ اللہ کے کاموں میں توازن نہ رہے۔

اب اگر خالق علٰیحدہ ہوتا اور رازق علٰیحدہ ہوتا۔ تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ کہ خالق دھڑا دھڑ بنائے جا رہا ہے اور اس کو کوئی پتہ نہیں کہ رازق کے پاس رزق ہے یا نہیں؟

اور رازق کو پتہ ہی نہیں کہ خالق نے کتنے بنا لیے ہیں؟۔ میں نے کتنے کی روٹی کا انتظام کرنا ہے، تو یہ عدمِ توازن قائم ہو سکتا تھا۔

مدرسے میں بیٹھے ہوئے دفتر میں داخلہ کوئی اور کر رہا ہو اور مطبخ کا ناظم کوئی اور

ہو۔تو ایسا ہو جاتا ہے۔ جی! دس بچوں کو روٹی نہیں ملی۔ناظم سے پوچھو۔ بھئی! کیوں؟۔ کہتا ہے۔ مجھے وقت پہ اطلاع نہیں ہوئی۔ کہ داخلہ ہو گیا۔

اچھا! ناظم نے روٹی پکائی، کھلائی، بیس بچوں کی روٹی بچ گئی۔ پوچھا جائے۔ کیوں بچ گئی؟۔ کہتا ہے۔ کہ مجھے اطلاع نہیں ہوئی کہ یہ چھٹی پہ گئے ہوئے ہیں۔تو یہ عدم توازن ہو گیا نا؟۔(جی)

لیکن یہاں تو جو خالق ہے وہی رازق ہے۔تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ پیدا کرے اور اس کا رزق نہ ہو۔ اور جس کو پیدا کرے۔ اسکے رزق کا انتظام نہ کرے۔ یہ عدم توازن اللہ کے فعلوں میں نہیں ہے۔ یہ رزق کے اندر گڑبڑ تم نے خود کر رکھی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے رزق بہت پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ تمہارے لیڈر، بے ایمان قسم کے، کمینے، جو ساری دولت اکٹھی کر کر کے باہر لیے جا رہے ہیں۔ یہ تمہارے اوپر مسکنت ڈال رہے ہیں۔ قرضے لے لے کے خود اپنے خزانوں میں جمع کر لیے اور تمہیں قرضوں میں دبا دیا۔ یہ ساری کی ساری بے اعتدالی ان کمینوں کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اللہ نے بہت رزق رکھا ہے۔

جس وقت آبادی کم تھی۔ اس وقت پیداوار کم تھی۔ ہمیں پتہ ہے اپنی زندگی کی ابتداء میں۔ کہ ایک ایکڑ میں سات من، آٹھ من گندم پیدا ہوتی تھی۔ اب اگر آبادی بڑھ گئی تو زمینداروں سے پوچھو کہ ایک ایکڑ سے گندم کتنی پیدا ہوتی ہے؟۔ اور پہلے کپاس کتنی پیدا ہوتی تھی اور اب کتنی پیدا ہوتی ہے؟۔اور پہلے زمین کتنی آباد تھی اور کتنی بے آباد پڑی تھی اور اب کتنی آباد ہو گئی اور اب بھی کتنی بے آباد پڑی ہے۔

پہلے آبادی کم تھی۔ تو تم سرسوں کے تیل جلاتے تھے دیے کے طور پر۔ آبادی بڑھی تو اللہ نے تمہیں مٹی کا تیل دے دیا جو سرسوں سے سستا تھا۔ پھر آبادی بڑھی تو اللہ نے تمہیں بجلی دے دی۔

جب آبادی کم تھی تو تم لکڑیاں جلاتے تھے۔ آبادی بڑھی تو اللہ نے تمہیں کوئلہ

دیدیا۔ پھر آبادی بڑھی تو اللہ نے تمہیں گیس دے دی۔ اور اب سورج کی شعاؤں سے گرمی حاصل کرنے کا طریقہ بھی آ گیا۔ کہ سورج سے گرمی حاصل کر کے تم جو چاہو۔ پکاتے رہو۔ کھاتے رہو، تم اللہ کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق محنت کرو۔ رزق کے دروازے کیسے کھل رہے ہیں۔

آنے والوں کا رستہ نہ روکو۔ بلکہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، اللہ کے خزانے تلاش کرو۔ زمین بھری پڑی ہے۔ جتنی جتنی آبادی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اتنے رستے کھولتے چلے جاتے ہیں۔ آبادی بڑھ گئی اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن دیکھو۔

- عمارتیں اونچی بن گئیں۔
- سڑکیں اچھی بن گئیں۔
- پل عمدہ بن گئے۔
- کاریں زیادہ آ گئیں۔

ہر چیز زیادہ آ گئی۔ یہ فقر و فاقہ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ کہاں آ رہا ہے؟۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ خوشحالی آ رہی ہے۔ جب آبادی تھوڑی تھی تو کیا یہ خوشحالی تھی؟۔ جیسے جیسے آبادی بڑھی دیکھو کتنی خوشحالی آ رہی ہے۔

یہ سارے کے سارے یہودیوں اور نصرانیوں کے پڑھائے ہوئے سبق ہیں اور ہمارے ان جاہل لیڈروں کو جو کچھ اوپر سے القاء ہوتا ہے۔ وہی شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ رزق میں کوئی کمی نہیں۔ بے اعتدالی ہماری اپنی ہے۔ اگر آبادی کم کرنے کا بہت ہی شوق ہو۔ تو آنے والوں کا رستہ نہ روکو۔ (میں ایک مشورہ دے دیتا ہوں۔ بلا فیس) آنے والوں میں تو پتہ نہیں۔

- کتنے ہیں......... جو ڈاکٹر بنیں گے۔
- کتنے ہیں......... جو انجینئر بنیں گے۔

- کتنے ہیں.........جو سائنسدان بنیں گے۔
- کتنے ہیں.........جو مفتی بنیں گے۔
- کتنے ہیں.........جو عالم بنیں گے۔
- کتنے ہیں.........جو خوبیوں والے ہوں گے۔

تمہیں کیا پتہ؟۔ آنے والوں کا تو پتہ نہیں۔ ہاں البتہ آبادی کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کو تم ریٹائرڈ (Retired) کر کے بٹھا دیتے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ اب ان کے کام کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ان کو اگر چلتا کرنے کی فکر کرو۔ ان سب کو محاذ پہ بھیج دو۔ شہادت کا درجہ حاصل کریں۔ اور مکان خالی کر دیں۔ بوڑھوں کیلئے آپ انتظام کرو۔ آنے والوں کو آنے دو۔ جن سے تم نے فائدہ اٹھالیا اور وہ ہو گئے ریٹائرڈ (Retired) تو کیا اچھا ہوتا کہ یہ تدبیریں جو ہمیں سکھاتے ہیں۔ ان کے ماں، باپ کو یہ تدبیریں سمجھ میں آتیں۔ آج یہ سبق ہمیں پڑھاتے ہیں۔ کاش! ان کے ماں باپ کو یہ سبق یاد ہوتا۔ تو ان بے ایمانوں سے جان چھوٹ جاتی۔

یہ ساری خرافات ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں یہ بات یاد رکھیے۔ یہ مشرکانہ نظریہ ہے۔ جس کے تحت یہ کیا جا رہا ہے۔ اسلام میں جس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ البتہ شخصی طور پر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کہ ایک گھر کے اندر بیمار ہیں، وہاں بچے کی گنجائش نہیں۔ وہاں کوئی تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے، کہ حمل نہ ہونے دیا جائے کیونکہ عورت کی جان کو خطرہ ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور بات ہو۔ شخصی فیصلہ ٹھیک ہے۔ قومی تحریک ٹھیک نہیں۔

یہ قومی تحریک جس انداز میں چلائی جا رہی ہے کہ "کھائیں گے کہاں سے؟۔ کھائیں گے کہاں سے"؟۔ یہ وہی مشرکانہ نظریہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ اللہ پیدا کرنے والا ہے تو اللہ رزق بھی دیتا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے کہ جیسے آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ خوشحالی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ تنگی ہونے کی بجائے ہماری آنکھوں کے سامنے تو یہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

سبحانك اللّٰھم وبحمدك اشھدان لا الٰه الا انت استغفرك واتوب الیك
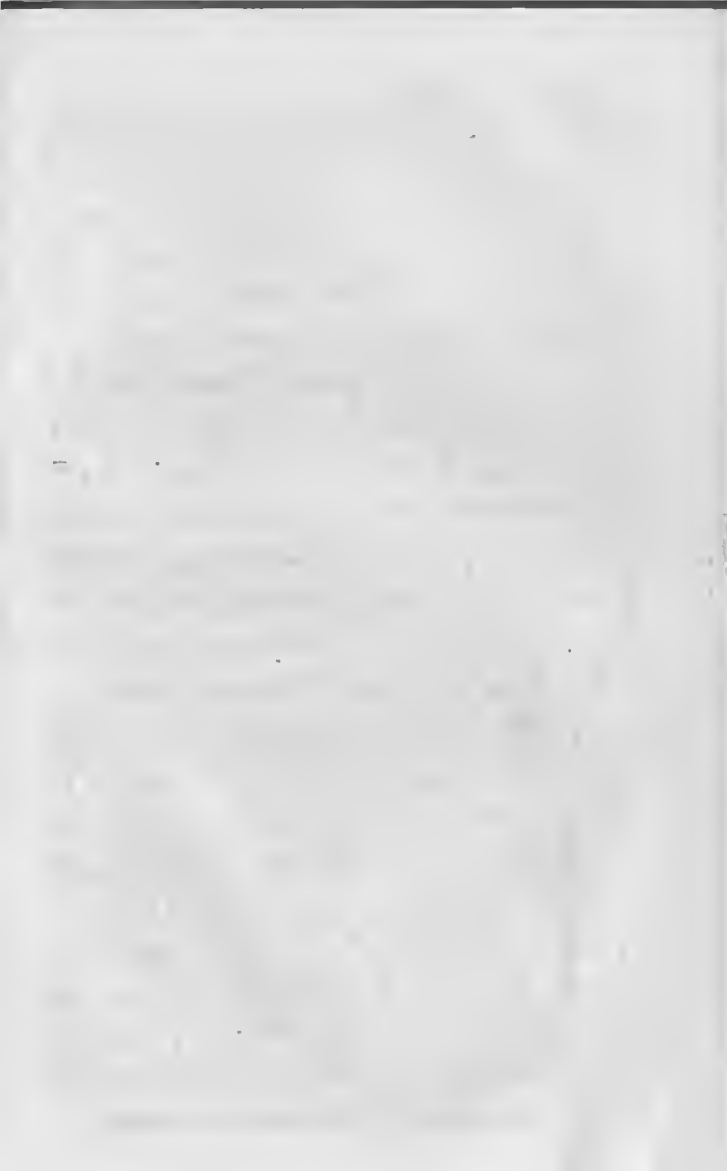
شرک کی حقیقت

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" (سورہ انبیاء. آیت. ۲۵)

"وَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم مَنْ کَانَ آخِرُ کَلَامِہٖ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ" (ابو داؤد. ۸۸/۲. مشکوۃ.۱۴۱/۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذَالِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

خدائی حکومت کو انسانی حکومت پر قیاس کرلیا:

گذشتہ بیان میں آپ کے سامنے مشرکین کے شرک کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ کہ وہ شرک کس طرح سے کرتے تھے۔ جبکہ قرآن کریم بار بار شہادت دیتا ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے۔ کہ فلاں کام کس نے کیا؟ فلاں کام کون کرتا ہے؟ تو ان کا جواب ہوتا ہے.......اللہ.......

- زمین کس نے پیدا کی؟.........کہتے اللہ نے
- آسمان کس نے پیدا کیا؟.......کہتے اللہ نے۔

وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود بھی مشرک تھے۔ تو ان کے شرک کرنے کی صورت کیا تھی؟ وہ بات میں نے آپ کو سمجھائی تھی۔ اگر آپ بھول نہ گئے ہوں تو آپ کو یاد ہو گا۔ کہ میں نے کہا تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حکومت کو انسانوں کی حکومت پر قیاس کر کے۔ یہ تصور قائم کر رکھا تھا۔ کہ بڑا تو ہر معاملے میں اللہ ہے لیکن اتنی بڑی کائنات کا انتظام اکیلا اللہ نہیں کر سکتا۔ تو جیسے بادشاہ

- صوبوں کے گورنر بناتا ہے۔
- گورنروں کے نیچے کمشنر ہوتے ہیں۔
- ان کے نیچے ڈپٹی کمشنر ہوتے ہیں۔

اوپر سے نیچے تک حکام کا ایک سلسلہ چلا آتا ہے۔ حتیٰ کہ آخری آخری درجے کے حکام میں جو مقامی ہوا کرتے ہیں۔ انتظامی امور میں جیسے یہ تھانہ ہو گیا۔ یا یہ چھوٹے چھوٹے افسر جو چھوٹے چھوٹے شہروں میں بیٹھے ہیں۔ یہ آخری کنارہ ہوتا ہے حکام کا۔ اور یہ حکام ہی کہلاتے ہیں۔ ان کو اختیارات تو اوپر والا ہی دیتا ہے۔ ان کا بھی بڑا وہ ہے۔ (اس بات کو یاد رکھنا۔ تبھی جا کے آپ کو موجودہ شرک سمجھ میں آئے گا۔ جو لوگوں کے ذہن میں بیٹھا ہوا ہے) اختیارات ان کو بڑا ہی دیتا ہے اور وہ لے بھی سکتا

ہے۔

لیکن جتنی دیر تک ان کو اس نے بنایا ہوا ہے۔اتنی دیر تک مخلوق کا تعلق ان کے ساتھ ہے۔ بڑے کے ساتھ نہیں ہے۔

- آپ کو ضرورت پیش آئے گی۔تو آپ اپنے مقامی تھانے میں جائیں گے۔
- آپ کو ضرورت پیش آئے گی۔آپ اپنی مقامی عدالت میں جائیں گے۔
- آپ کو ضرورت پیش آئے گی۔تو آپ اپنے مقامی ناظم کے پاس جائیں گے۔
- آپ کو ضرورت پیش آئے گی۔تو آپ اپنے مقامی نمبر دار کے پاس جائیں گے۔
- آپ کو ضرورت پیش آئے گی۔آپ اپنے علاقے کے پٹواری کے پاس جائیں گے۔

تو آپ کا تعلق ان چھوٹے حاکموں کے ساتھ ہے۔ جو آپ تک پہنچتے ہوئے۔ یہ حکام کا آخری کنارہ ہے۔اور یہ جو فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ اوپر والوں سے پوچھ کے نہیں کرتے۔ بلکہ جو ان کو اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ان اختیارات کے تحت یہ آزادنہ فیصلہ کرتے ہیں۔اوپر سے پوچھنے کے محتاج نہیں ہیں۔اور جو رپورٹ یہ لکھ دیں گے اوپر تک وہی رپورٹ (Report) جائے گی۔

اور اگر آپ براہ راست اوپر والوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیں گے۔تو آپ کی درخواست نہیں لیں گے۔ وہ کہیں گے۔ کہ پہلے مقامی حاکم کے پاس جاؤ۔ اور وہ سفارش کر کے اوپر بھیجنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ براہ راست صدر آپ کی درخواست نہیں لے گا۔ کہ آپ وہاں جائیں اور جا کے کہیں کہ میرا پڑوسی مجھے تنگ کرتا ہے۔ وہ کہیں گے مقامی تھانیدار کے پاس جاؤ۔ یا آپ صدر کو جا کر کہیں ۔ کہ کسی نے میری زمین دبالی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ میری کتنی ہے اور فلانے کی کتنی ہے؟۔ وہ کہیں گے پٹواری کے پاس جاؤ۔ وہ رپورٹ کرے گا تو اوپر کے حکام توجہ دیں گے۔ ورنہ جب

تک نیچے والا رپورٹ نہ کرے اس وقت تک اوپر والے کچھ نہیں کر سکتے۔ دنیا میں جو موجودہ حکومت ہے۔اس کا نقشہ یہی ہے۔

میں نے کہا تھا۔ اس تقریر کو ایسے نہ سمجھا کرو۔ جیسے کسی جلسے کے اندر کوئی لیکچر (Lecture) دے دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کو سبق سمجھا کرو، اور سبق کی طرح سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔آپ کو صرف بات سمجھانی مقصود ہے،

تو جس وقت ہمارا تعلق ان حکام کے ساتھ ہوا۔ جو ہمارے اوپر مسلط ہیں اور حکام کے سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔تو ہم ان کو خوش رکھنے کی کوشش کریں گے۔صدر سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔

- پٹواری خوش ہوگا..........رپورٹ صحیح کرے گا۔
- تھانیدار خوش ہوگا..........ہمارا لحاظ کرنے گا۔
- جج خوش ہوگا..........ہماری رعایت کرے گا۔

ان کو خوش رکھنے کیلئے۔ ان کو ہم رشوتیں دیتے ہیں، ان کا ہم ادب کرتے ہیں، ان کا ہم احترام کرتے ہیں، ان سے ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ ہمارے خلاف غلط رپورٹ نہ کر دیں۔ اور ان کو خوش رکھ کے ہم اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہمارے دل کا تعلق، ہمارے دماغ کا تعلق انہیں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ جو براہ راست ہمارے اوپر حاکم ہیں۔ یہ مثال میں نے پچھلے بیان میں آپ حضرات کو سمجھائی تھی۔

مشرکین کا تلبیہ:

اسی کو ہی اور واضح طریقے سے ذرا اپنے دل میں بٹھا لیجیے۔

مشرکین مکہ یا اس زمانے کے مشرک۔ حج کرنے کیلئے جاتے تھے۔عمرہ کرنے کیلئے جاتے تھے۔ باقاعدہ احرام بھی باندھتے تھے اور تلبیہ بھی پڑھتے تھے۔تلبیہ جو حاجی احرام باندھ کے پڑھا کرتا ہے۔

"لَبَّيكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيك لَبَّيك لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيكَ. اِنَّ الحَمدَوَالنِّعمَة لَكَ وَالمُلكَ لَا شَرِيكَ لَكَ."

(بخاری ۱/۲۱۰۔ مسلم ۱/۳۷۵۔ مشکوۃ ۱/۲۲۳)

یہ ہے تلبیہ جو ہم پڑھا کرتے ہیں۔ تو مشرک بھی تلبیہ پڑھتے تھے۔ مشرک تلبیہ یوں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ صحیح روایات میں ہے۔

" لَبَّيكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيك. لَبَّيك لَا شَرِيكَ لَكَ اِلَّا شَرِيكاً هُوَلَكَ تملكه وَمَا مَلَكَ."

(مشکوۃ۔ ۱/۲۲۴۔ مسلم ۱/۳۷۶)

یہ مشرکوں کا تلبیہ تھا، معنی کیا ہے؟۔ کہ اے اللہ! تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہاں ایسے شریک ہیں۔ جن کا تو مالک ہے۔ وہ تیرے مالک نہیں ہیں۔ یعنی ہمارے شریک تیرے مملوک ہیں۔ تیرے مالک نہیں ہیں۔ تیرے برابر کا تیرا شریک کوئی نہیں۔ ہاں البتہ یہ تیرے چھوٹے ہیں۔ جن کو تو نے اپنے ساتھ شریک بنا رکھا ہے۔ وہ تیری ملک میں ہیں۔ تو ان کا مالک ہے۔ وہ تیرے مالک نہیں ہیں۔

مشرکین کے نزدیک شرکاء کا تصور:

تو اس سے شرک کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ کہ مشرک اللہ کے برابر کسی کو نہیں ٹھہراتے تھے۔ کہ جیسا اللہ ویسا کسی دوسرے کو مان لیں۔ بلکہ وہ کہتے تھے یہ اللہ کے تابع ہیں۔ اللہ کے مملوک ہیں۔ لیکن اللہ نے ان کو اختیارات دے رکھے ہیں۔ یہ اللہ کے مالک نہیں۔ اللہ ان کا مالک ہے۔ وہ ان کو چھوٹا بنا کے مانتے تھے۔ نیکن بہت شریک تھے۔ یعنی یہ شریک ہیں اختیارات میں۔ اگرچہ اختیارات دیے ہوئے اللہ کے تھے۔ یہ نکتہ آپ کے ذہن میں آ گیا؟۔ (جی)

قرآن کریم میں ان شرکاء کیلئے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کہ وہ مشرک کہتے

"هٰؤُلَاءِ شُفَعَائُنَا عِندَاللّٰهِ"(سورہ یونس آیت ۱۸)

یہ ہمارے شرکاء ہمارے شفعاء ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ ہماری سفارشیں کرتے ہیں۔

تو آپ جانتے ہیں کہ سفارش بڑے کے سامنے ہی کی جاتی ہے۔ اور سفارش چھوٹے کرتے ہیں۔ تو یہ تابع ہی ہوئے۔

لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ سفارشی کیسے مانتے تھے؟۔ وہ اس طرح سفارشی مانتے تھے کہ جو وہ کہیں گے۔ اللہ کے سامنے ہماری رپورٹ پیش کر دیں گے۔ اللہ اس میں تغیر تبدل نہیں کرے گا۔ اللہ اس کو مان لے گا۔ جس کیلئے آپ تفسیروں میں لفظ پڑھیں گے کہ وہ شفاعتِ جبری کے قائل تھے۔ کہ چھوٹے کی سفارش کی ہوئی اللہ ٹھکراتا نہیں۔ بلکہ جو کچھ یہ رپورٹ (Report) کر دیں اللہ اس کے مطابق ہی کرتا ہے۔

جیسے یہاں پٹواری جو کچھ لکھ دے گا۔ اوپر تک حاکم اسی کا اندراج کرتا چلا جائے گا۔ تو گویا کہ یہ پٹواری شفعاء میں داخل ہے۔ کہ ہمارے متعلق جیسی یہ سفارش کرے گا اوپر تک اندراج اسی طرح سے ہوتا چلا جائے گا۔ اس کو شفاعتِ جبری کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ہمارے کام کروادیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم براہ راست تو بڑے حاکم سے مل نہیں سکتے تھے۔ جس کیلئے جاہل لفظ بولتے ہیں (خیال کریں!۔ اصل میں ان کا شرک آپ کو سمجھانا ہے۔ اور پھر اس شرک کی روشنی میں موجودہ شرک سمجھانا ہے جس کا تعلق آپ سے ہے۔) وہ کہتے تھے

ساڈیاں تیرے اگے تے تیریاں رب دے اگے

اب بات سمجھ گئے؟۔ (جی) یعنی رب کے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ ہم نے تو جو کچھ کہنا ہے۔ تجھے کہنا ہے۔ باقی تو جان، تیرے اوپر والا جانے۔ اوپر والا وہی کرے گا جو تو کہے گا۔ اوپر والا ہماری سنتا نہیں اور تیری موڑتا نہیں۔ یہ فقرے ہیں۔ جو جاہلوں کی زبان پہ آتے ہیں۔ تو یہ وہی موجودہ حکومت کا نقشہ ہے۔ یہ ذہن بنالیا تھا کہ ہم نے

درخواست تمہیں دینی ہے۔ اور جو کچھ آگے کرتا ہے تم کرو یہ شفعاء والا مفہوم ہے۔ ہم تمہیں کہیں گے۔ کیونکہ تم ہماری سنتے ہو وہ نہیں سنتا۔
جب تم ہماری سن کے آگے کہو گے تو وہ آگے سے موڑتا نہیں۔ ایک تو ہے شفعاء کا مفہوم۔

شرکاء کی عبادت کا مقصد:

اور ایک دوسری بات ہے۔ مشرکین کے شرک کو سمجھنے کیلئے اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔ کہ وہ کہتے تھے

"مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى "(سورہ زمر آیت ۳)

ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں۔
یہ ہمیں اللہ کے قریب کریں گے تو ہمیں اللہ کا قرب حاصل ہوگا۔ براہ راست ہم اللہ کے قریب نہیں ہوسکتے۔ اس لیے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔ اگرچہ "مَا نَعْبُدُ" کا معنی تو ہے ہم انکی عبادت نہیں کرتے۔ لیکن "اِلَّا" نے آ کے نفی کو توڑ دیا۔ یعنی ہم انکی عبادت کسی مقصد کیلئے نہیں کرتے مگر اس مقصد کیلئے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں۔ ان کے وسیلے کے ساتھ، ان کے واسطے کے ساتھ ہم اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ ہم اس لیے انکی عبادت کرتے ہیں دو باتیں ہوگئیں؟۔ عبادت کا لفظ یاد رکھنا۔

- ان کیلئے شرکاء کا لفظ استعمال کرتے تھے۔
- ان کیلئے شفعاء کا لفظ استعمال کرتے تھے۔
- ان کیلئے اٰلہہ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔
- اور جو کچھ ان کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے اس کو عبادت قرار دیتے تھے۔

اور وہ صاحب لسان تھے۔ اس لیے عبادت کے مفہوم کو بھی سمجھتے تھے۔ الٰہ کے مفہوم کو بھی سمجھتے تھے۔ تو اس سب کو جاننے کے باوجود ان کے ساتھ وہ حرکتیں کرتے

تھے۔ جس کو عبادت کہتے تھے۔ یہ ان کے شرک کا تانابانا ہے۔

اور اصل کے اعتبار سے تو شخصیات تھیں۔ جن کو پوجتے تھے۔ جیسے میں نے آپ کو بتایا کہ نوح علیہ السلام کی قوم سے شرک شروع ہوا۔ تو ان کے جو پانچ بت تھے۔ بخاری میں آتا ہے کہ یہ اس قوم کے اولیاء اللہ تھے، صالحین تھے۔ مرنے کے بعد انہوں نے ان کے بت تراش کر کے رکھ لیے۔ چونکہ کیمرے تو ہوتے نہیں تھے۔ پتھر کے تراش کر کے رکھ لیے۔

ادب واحترام اور محبت کے اظہار کے طور پر۔ آہستہ آہستہ انہیں کے متعلق یہ عقیدہ ہوگیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا نائب بنا کر ان کو اختیارات دے دیے ہیں۔ اس لیے اب ہم ان سے بات کریں گے۔ یہ اللہ سے کریں گے۔ شرک شروع یوں ہوا ہے۔ (بخاری ۲/۷۳۲)

اللہ کی طرف سے مقررہ شدہ فرشتے:

اب اس بات کو سامنے رکھ کر۔ ایک اس کے مقابل دوسری بات بھی سن لیجیے۔ ہم جس وقت اپنے عقیدے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں۔ اللہ ایک ہی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت، اپنی حکومت میں مختلف شعبے بنائے ہیں۔ اور ان مختلف شعبوں میں اللہ تعالیٰ نے فرشتے متعین کیے ہیں۔

- اللہ تعالیٰ نے اپنا علم اتارا ہے جبریل کی وساطت سے۔
- اللہ تعالیٰ موت دیتا ہے۔ عزرائیل کی وساطت سے۔
- اللہ تعالیٰ بارش اور رزق اتارتا ہے۔ میکائیل کی وساطت سے۔

یہ عقیدہ ہے یا نہیں؟ (جی)۔

فرشتے متعین ہیں یا نہیں؟ (جی)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ عورت کے رحم پر بھی فرشتے متعین ہے جو وہاں بچے کی پرورش کرتا ہے۔

(بخاری ۱/۴۶۔ مسلم ۲/۳۳۳)

تو دنیا کے جتنے کام ہیں وہ سارے کے سارے ہم نے بھی فرشتوں کے متعلق کر رکھے ہیں۔ اور شفاعت کا عقیدہ ہمارا بھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کاموں میں تقسیم کا قول ہم بھی کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ جہنم اللہ کا جیل خانہ ہے۔ اور اس جیل خانے کے اوپر اللہ نے ۱۹ فرشتے منتظم بنائے ہیں۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ. (سورہ مدثر . آیت ۳۰)

تو ۱۹ فرشتے اس کے انتظام کیلئے متعین ہیں۔ اور ان کا ایک بڑا افسر ہے۔ جس کو مالک کہتے ہیں۔ جیسے قرآن میں اللہ کافروں کا قول نقل کرتے ہیں۔

" يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ" (سورہ زخرف آیت ۷۷)

جب مشرک عذاب میں ہوں گے تو کہیں گے۔ اُے مالک! اپنے رب سے کہہ کے ہمیں موت ہی دلوادے۔ تو مالک یہ داروغہ جہنم ہے۔

اور اسی طرح سے جنت اللہ کا مہمان خانہ ہے۔ اور اس کا جو بڑا منتظم ہے۔ اس کو رضوان کہتے ہیں۔ اور وہاں بہت سارے فرشتے خدمت کیلئے متعین ہیں۔ تو جنت کا انتظام بھی سارا فرشتے کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سے علم جتنا بھی اتارا اللہ نے۔ جبریل کی وساطت سے اتارا۔ اور موت اللہ دیتا ہے۔ عزرائیل کی وساطت سے جیسے قرآن کریم میں ہے۔

" يَتَوَفَّاكُم مَلَكُ الْمَوتِ" (سورہ سجدہ آیت ۱۱)

ہم تو کہتے ہیں کہ موت اللہ دیتا ہے۔ لیکن اللہ فرماتے ہیں کہ تمہیں ملک الموت وفات دیتا ہے۔ وہ جان نکالتا ہے۔

اور ایسے ہی ہر کام اللہ تعالیٰ نے تقسیم کیا ہے۔ اور فرشتوں کی وساطت سے وہ کام ہوتا ہے۔ تو واسطے تو ہم نے بھی مان لیے۔ اور انتظام کے اندر فرشتے تو ہم نے بھی

دخیل کر دیے۔ سفارش کا عقیدہ ہمارا بھی ہے۔

+ انبیاء بھی سفارش کریں گے۔
+ اولیاء اللہ بھی سفارش کریں گے۔
+ حفاظ بھی سفارش کریں گے۔
+ علماء بھی سفارش کریں گے۔
+ شہداء بھی سفارش کریں گے۔
+ فرشتے بھی سفارش کریں گے۔
+ چھوٹے چھوٹے بچے بھی سفارش کریں گے۔

یہ ساری روایتیں آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ سنتے رہتے ہیں۔ تو سارے کا سارا نظام حکومت آپ نے بھی قائم کر رکھا ہے۔ پھر آپ کے اور مشرکوں کے عقیدے میں فرق کیا ہوا؟۔

واسطے ہم بھی مانتے ہیں ہم سفارش کے بھی قائل ہیں۔ اور تقسیم کار کے بھی قائل ہیں۔ اور نسبتیں خود فرشتوں کی طرف قرآن میں موجود ہیں

"فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا" (سورہ نازعات آیت ۵)

مدبّرات سے ملئکتہ مراد ہیں۔ کہ کاموں کی تدبیر کرتے ہیں۔

"لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا" (سورہ مریم آیت ۱۹)

جبریل علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کو اپنی طرف نسبت کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ میں اس لیے آیا ہوں تاکہ تجھے پاکیزہ، متقی بچہ عطاء کروں۔

یہ فرشتوں کا نظم تو باطنی طور پر ہے جو تمہیں نظر نہیں آتا ہے۔ اب ہم کہتے ہیں اللہ خالق ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے۔ لیکن اللہ کا خلق ہمیں نظر آتا ہے۔ والدین کی وساطت سے۔ تو والدین واسطہ ہیں۔

+ علم اللہ دیتا ہے لیکن ظاہر میں استاد واسطہ ہے۔

✦ صحت اللہ دیتا ہے لیکن ڈاکٹر کے واسطے سے دیتا ہے۔

اسی لیے موجودہ جاہل لوگ کہتے ہیں کہ تم گولی کو تو قبض کشا مانتے ہو کہ کوئی گولی کھالے تو قبض ٹھیک ہو جاتی ہے۔ ولی کو مشکل کشا نہیں مانتے۔ آپ گولی کو قبض کشا کہتے ہو یا نہیں کہتے؟ (کہتے ہیں)۔ تو اگر گولی قبض کشا ہو سکتی ہے تو کیا اللہ کا ولی مشکل کشا نہیں ہو سکتا؟۔

رازق اللہ ہے۔ لیکن رزق کیلئے اللہ نے کتنے اسباب بنائے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ آسمان سے براہ راست رزق لے لیں۔ تو نہیں مل سکتا۔ اسی لیے رزق کو تلاش کرنے کیلئے آپ کو ہل جوتنا پڑے گا، تو ہل واسطہ بن گیا۔ پانی کی بھی ضرورت ہے تو پانی واسطہ بن گیا۔ تو واسطے تو آپ نے بھی مان لیے ہیں اور آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ بڑا اللہ ہے، تو کیا فرق ہوا تمہارے اور مشرکوں کے عقیدے میں؟۔ بس آپ کو یہی فرق بتانا چاہیے۔

مشرک اور موحد میں بنیادی فرق:

ان سب واسطوں کو ماننے کے باوجود ہم ان کو الٰہ نہیں کہتے، ان کیلئے الٰہ کا لفظ نہیں بولتے۔ اور ہم

- ماں باپ کا ادب کرتے ہیں۔
- استاد کا ادب کرتے ہیں۔
- ڈاکٹر کا احترام کرتے ہیں۔

لیکن ہم اپنے اس برتاؤ کو عبادت نہیں کہتے۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم اپنے والدین کی عبادت کرتے ہیں یا ہم اپنے ڈاکٹر کی عبادت کرتے ہیں۔

تو آخر یہ فرق آپ کس طرح سے سمجھیں گے؟ کہ وہ واسطوں کو الٰہ کہتے تھے اور ان کے ساتھ جو برتاؤ کرتے تھے اس کو عبادت کہتے تھے۔ ہم واسطوں کو نہ الٰہ کہتے ہیں اور ان کے ساتھ جو ادب واحترام کا معاملہ کرتے ہیں نہ ہم اس کو عبادت کہتے ہیں۔ تو

ان دونوں میں فرق کیا ہے؟۔ اب یہ نکتہ اگر سمجھ میں آجائے تو شرک اور توحید میں فرق بہت شاندار سمجھ میں آجائے گا

اب فرق سمجھ لیجیے!۔ ہم اللہ کی حکومت کو انسانوں کی حکومت پر قیاس نہیں کرتے۔ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جیسے ایک بادشاہ سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اللہ کا معاملہ بھی ایسا ہے۔........ نہیں...... ہم کہتے ہیں کہ اللہ ساری کائنات کا انتظام کرتا ہے۔ دنیا کا بادشاہ اپنے چھوٹے حاکموں کا محتاج ہے۔ کہ جس وقت تک وہ تعاون نہیں کریں گے۔ اسکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ اللہ کیلئے درمیان میں ایسا کوئی واسطہ نہیں کہ ہم کہیں کہ اللہ اس کے بغیر کام کر نہیں سکتا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ سب سے مستغنی ہے۔ اللہ کو کسی قسم کی ضرورت نہیں۔

بادشاہ کو اپنی رعایا کا علم نہیں ہوتا کہ کون بیمار ہے؟۔ کہاں پڑا ہوا ہے؟۔ کون بھوکا ہے جس کو روٹی کی ضرورت ہے؟۔ اس کو کچھ پتہ نہیں ہوتا [illegible] بتائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا علم پوری کائنات کو محیط ہے۔ درخت کا ایک پتہ بھی گرتا ہے تو اس کو پتہ ہے۔

وہ کہتے تھے اللہ ہماری سنتا نہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں۔ ہمارا اللہ ہر وقت، ہر جگہ، ہر کسی کی، ہر بات سنتا ہے، اس لیے اللہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہمارے ہر حال کو جانتا ہے۔ ہمارے متعلق کامل علم بھی رکھتا ہے۔ اور ہماری ہر پکار کو، ہر گفتگو کو سنتا بھی ہے، وہ ہم سے لاتعلق نہیں ہے، اس طرح سے پردے میں نہیں ہے کہ اس کو ہمارے حال کی خبر نہ ہو۔

اس لیے یہ جو اللہ نے کارندے متعین کیے ہوئے ہیں ان کو کوئی ایسے اختیارات حاصل نہیں کہ جس طرح سے دنیا میں اختیارات حاصل ہونے کے ساتھ وہ حاکم کہلاتا ہے۔ ان کو اختیارات حاصل نہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت وہ ہے جیسے حاکم کے دروازے کے اوپر ایک چپڑاسی کھڑا ہوتا ہے۔ حاکم اس کو کہتا ہے۔ یہ کاغذ لے اور فلاں جگہ دے

کے آ۔ وہ چپ کر کے جا کے دے آئے گا۔

وہ کہے کہ زید کو دے کے آ۔ تو وہ زید کو دے کے آئے گا۔ اسے بکر کو دینے کا اختیار نہیں ہے۔

وہ کہے کہ بکر کو دے کے آ۔ تو وہ بکر کو دے کے آئے گا۔ اسے زید کو دینے کا اختیار نہیں ہے۔

اس کو جو حکم دیا جائے وہ اس کی تعمیل کرتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حاکم کی حکومت کے جاری ہونے میں واسطہ تو بنا ہے۔ لیکن وہ بے اختیار واسطہ ہے۔

فرق سمجھانے کیلئے بہترین مثال:

میں اس کو سمجھانے کیلئے آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہو گا۔ کبھی کبھی ڈاکیا کسی طالب علم کے نام منی آرڈر (Money Order) لے کے آتا ہے۔ آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ جن کو والدین پیسے بھیجتے ہیں اور ڈاکیا آ کے پہنچا کے جاتا ہے۔ ڈاکیا آیا۔ آ کے اس نے پوچھا کہ عبدالرحمٰن بن فلاں کہاں ہے؟۔ وہ آ گیا۔ تو ڈاکیا کہے گا۔ یہ ۱۰۰ روپے کا منی آرڈر ہے۔ یہ ۱۰۰ روپیہ لے اور یہاں دستخط کر دے۔ وہ ۱۰۰ روپیہ لے کر دستخط کر دے گا۔ عبدالرحمٰن نے دستخط کر کے منی آرڈر وصول کر لیا۔

ساتھ بیٹھا ہوا عبداللہ دیکھ رہا تھا کہ ڈاکیے نے اس کو ۱۰۰ روپیہ دیا ہے۔ اب عبداللہ ڈاکیے کے پاس جا کے اس کے قدم پکڑ لیتا ہے۔ کہتا ہے کہ دیکھ! میں تجھے سجدہ کرتا ہوں۔ کل کو میرے لیے بھی ۱۰۰ روپے کا منی آرڈر لے کے آنا۔

- میں تجھے چائے پلاؤں گا۔
- میں تجھے کھانا کھلاؤں گا۔
- میں تیرے پاؤں دباؤں گا۔
- میں تجھے مٹھائی کھلاؤں گا۔
- جو خدمت تو چاہے مجھ سے کروا لے۔

میرے لیے کل کو منی آرڈر لے کے آنا۔ تو عبداللہ ڈاکیے کے پیچھے لگ گیا۔ تو ڈاکیا کیا کہے گا؟۔ وہ کہے گا۔ کہ پاگل! منی آرڈر لانا میرے اختیار میں ہے؟۔ اپنے والدین کو کہہ۔ وہ جمع کروائیں۔ بھیجیں۔ جب آئیں گے تو میں تجھے پہنچا دوں گا،

- آپ کے سجدہ کرنے سے۔
- آپ کے ہاتھ جوڑنے سے۔
- آپ کی لجاجت کرنے سے۔
- آپ کے چائے پلانے سے۔
- آپ کے مٹھائی کھلانے سے۔

وہ منی آرڈر لا دے گا؟ (نہیں)۔ اور اگر پیچھے سے آیا ہوگا۔ تو وہ ناک رگڑ کر پہنچا کے جائے گا۔ اس کی کیا جرأت ہے کہ نہ پہنچا کے جائے؟۔

تو ہم ان کارندوں کو مانتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایک ایک ذرہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کہے کہ فلاں کی جان نکالنی ہے۔ عزرائیل کی مجال نہیں کہ وہ نہ نکالے۔ اور اگر عزرائیل نے ایک کی جان نکالی تو دوسرے بچوں کے والدین ڈر کے کہتے ہیں۔ یا عزرائیل .... یا عزرائیل .... اے عزرائیل! تو دس روپے ہفتے کے ہم سے لے لیا کر۔ اور جمعرات کو دودھ لے لیا کر۔ مہربانی کر کے ہمارے کسی بچے کی جان نہ نکالنا۔ کیا ہم ایسے کرتے ہیں؟ (نہیں) اور ایسا کرنے کے ساتھ عزرائیل چھوڑ دے گا؟ (نہیں)۔

بلکہ عزرائیل کہے گا کہ مجھے کیا کہتے ہو؟۔ میں تو پچھلے (اللہ رب العزت) کا پابند ہوں۔ اس نے کہا۔ کہ اس کی جان نکالنی ہے۔ میں نے نکال لی۔ اور اگر اس کی ماں کہے کہ۔ عزرائیل! میرے بچے کو چھوڑ دے میری جان نکال لے۔ اس کا باپ کہے۔ کہ عزرائیل! تو اس کو چھوڑ دے میری جان نکال لے۔ تو کیا عزرائیل ادل بدل کر لے گا؟۔ (نہیں)۔

وہ تو آرڈر (Order) کا پابند ہے۔ انکی پوزیشن (Position) وہ ہے جو اللہ نے بیان کی ہے۔

" لَا یَعْصُونَ اللّٰہَ مَا اَمَرَ ھُمْ"

اللہ جو حکم دے دے وہ نافرمانی نہیں کرتے۔

" وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْ مَرُوْنَ"

یہ وہی کام کرتے ہیں۔ جوان کو حکم دیا جاتا ہے۔ (سورہ تحریم آیت ٦)

توجب ہمارے ہاں ان کی حقیقت یہ ہے۔ تو ہم

- نہ عزرائیل کو پکاریں.........نہ عزرائیل کو نذرانے دیں۔
- نہ عزرائیل سے ڈریں.........نہ اس کے سامنے لجاجت کریں۔

ہم ان سب کو واسطہ تو سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کیلئے اختیارات نہیں مانتے۔ ان کے پاس کچھ بھی اختیار نہیں۔ اختیارات سارے اللہ کے پاس ہیں۔ یہ تو اللہ کے حکم کے پابند ہیں۔

بس موحد اور مشرک میں یہی بنیادی فرق ہے۔ انہی الفاظ پر اکتفاء کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزۃ ہمیں سمجھنے کی اور پھر سمجھ کر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرماتے۔

وآخر دعواناان الحمد للہ رب العالمین.

سوال: حضورﷺ کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ مسلمان ہیں یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ جنت میں جائیں گے یا نہیں؟

جواب: ہمارے اکابر کا عقیدہ یہی ہے۔ کہ یہ جنتی ہیں۔ اور ہم دوسرے پہلو پر کبھی گفتگو نہیں کرتے۔ اسکی تفصیل پھر کسی دن انشاء اللہ کی جائے گی۔ اگر ہم کہیں گے، بولیں گے، تو یہی کہیں گے کہ ناجی ہیں۔ ورنہ ہم خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

کیونکہ قرآن اور حدیث کے اندر اس بارے میں واضح بات کوئی نہیں۔ قرائن کے ساتھ ہمارے اکابر نے یہی مسلک اختیار کیا ہے کہ حضورﷺ کے والدین ناجی ہیں۔

نجات پائیں گے آخرت میں انشاء اللہ۔

سوال: وی سی آر پر کیا چیز دیکھنی جائز ہے؟

جواب: وی سی آر پر کوئی چیز دیکھنی جائز نہیں ہے۔ یہ فتنہ ایک ایسا آ گیا۔ آپ نیک نیتی کے ساتھ گھر میں جا کے رکھدیں۔ اور آپ یہ سمجھیں کہ ہم تو قرآن کریم کی کیسٹیں سنیں گے۔ لیکن جس وقت آپ گھر میں نہیں ہوں گے تو آپ کی بیویاں، بہنیں، بچے صرف یہی نہیں کہ وہ قرآن مجید سنیں گے۔ پھر وہ سب کچھ دیکھیں گے۔ اس لیے اس فتنے کو گھر میں نہ آنے دیں۔ یہ تو شیطان کو گھر میں داخل کرنے والی بات ہے۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهدان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك.

عقیدہ ربوبیت

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

بنی آدم کے مختلف حالات اور اس کی حکمت:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا۔ تو قرآن کریم میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے سامنے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد جو قیامت تک ہونے والی تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں اللہ تعالیٰ نے موجود کی۔ قرآن کریم میں سورہ اعراف (آیت ۱۷۲) میں یہ واقعہ ہے۔ کہ ساری اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ نے بیک وقت موجود کیا۔

حدیث شریف میں اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کہ جب ساری کی ساری اولاد آدم علیہ السلام نے دیکھی (یہ درمیان میں ایک بات کہہ دوں۔ اصل بات تو آگے آ رہی ہے۔ یہ کام کی بات ہے درمیان میں آ گئی۔) آدم علیہ السلام نے جس وقت اپنی اولاد کے اوپر نظر ڈالی۔ تو ان میں

- کوئی تندرست نظر آیا۔
- کوئی بیمار نظر آیا۔
- کوئی بینا نظر آیا۔
- کوئی اندھا، کانا نظر آیا۔
- کوئی ٹانگوں والا نظر آیا۔
- کوئی لنگڑا، لولا نظر آیا۔
- کوئی مالدار، غنی نظر آیا۔
- کوئی غریب، فقیر نظر آیا۔

اپنی اولاد کے مختلف حالات حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے آ گئے۔ آخر وہ باپ تھے۔ اولاد کے مختلف حالات دیکھ کے اللہ کے سامنے ایک درخواست کر دی کہ

﴿رَبِّ الولَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ "﴾

"اے میرے رب! تو نے سب کو ایک جیسا کیوں نہ بنا دیا؟۔"

یہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے درخواست کی۔ کہ یا اللہ! تو نے سب بندوں کو برابر کیوں نہ کر دیا؟۔ کہ ایک ہی جیسا بنا دیتا کہ

- سارے ہی صحت مند، تندرست ہوتے۔
- سارے ہی آنکھوں والے ہوتے۔
- سارے ہی ٹانگوں والے ہوتے۔
- سارے ہی مالدار ہوتے۔

سب کی کیفیت ایک ہی جیسی ہوتی۔ سارے برابر ہوتے۔ کوئی کمی بیشی نہ ہوتی۔ ایسا کیوں نہیں کیا؟۔

تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔

﴿إِنِّي أَحْبَبْتُ أَنْ أُشْكَرَ﴾

"آدم! میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے"

یہ اللہ تعالیٰ کا جواب ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں سب کو برابر بنا دوں تو شکر کوئی ادا نہیں کرے گا۔ یہ میں نے مختلف اس لیے بنائے ہیں تا کہ میرا شکر ادا کیا جائے۔ (مشکوۃ ص ۲۴ ج ۱)

آپ سوچیں گے کہ مختلف بنانے سے شکر کیسے ادا ہوگا۔ وہ یوں ادا ہوگا کہ آپ جس وقت دیکھیں گے کہ ایک آدمی نابینا ہے۔ اور وہ رستہ معلوم کرنے کے لیے، اپنے گھر جانے کے لیے، ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے دو آنکھیں دے رکھی ہیں۔ تو فوراً آپ کہیں گے یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے آنکھیں دے دیں۔ تو آنکھ کی نعمت کا احساس آپ کو ہوگا نابینے کو دیکھ کر۔ اگر کوئی شخص دنیا میں نابینا نہ ہوتا تو آپ کو آنکھ کی قدر نہ آتی۔ اس طرح نابینے کو دیکھ کے آنکھوں والا شکر ادا کرے گا۔

ایک آدمی کی ٹانگیں نہیں ہیں۔ جب آپ اس کو دیکھیں گے کہ اس کو کتنی مشکل

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ. ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ﴾

(سورہ آل عمران آیت/۵۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

پیش آتی ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے۔ تو آپ اپنی ٹانگوں کے اوپر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ کہ اللہ کا شکر ہے۔ میری ٹانگیں صحیح سالم ہیں۔ میں ٹھیک چلتا ہوں۔ تو

- ٹانگوں کی قدر ہوگی............... بے ٹانگوں کو دیکھ کر۔
- ہاتھوں کی قدر ہوگی.............. بے ہاتھوں کو دیکھ کر۔
- صحت کی قدر ہوگی................ بیماروں کو دیکھ کر۔
- غنیٰ (مالداری) کی قدر ہوگی........ فقیروں کو دیکھ کر۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت دی، اور کسی کو وہ نعمت نہیں دی۔ جب نعمت والا شخص کسی ایسے کو دیکھے گا۔ جس کے پاس وہ نعمت نہیں ہے۔ تو وہ شکر ادا کرے گا کہ اللہ نے مجھے یہ نعمت دے رکھی ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ:

غالباً بوستاں میں ہے۔ ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ بہت چلنے پھرنے والے تھے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ۔

> ''سفر میں ایک دفعہ میرا جوتا ٹوٹ گیا۔ پہننے کے قابل نہ رہا۔ تو مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ میں ننگے پاؤں ہوں۔ میرے پاس جوتا نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ چلتا ہوا میں دمشق میں جامع مسجد کے پاس پہنچا تو میں نے مسجد کے دروازے پر ایک شخص کو پڑے ہوئے دیکھا، جس کے پاؤں نہیں تھے۔ تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ پاؤں تو ہیں۔ جوتے نہیں ہیں تو کیا ہوا؟۔

یہ ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا طریقہ۔ اللہ کی نعمت کا احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب دوسرے شخص کو انسان اس نعمت سے محروم دیکھتا ہے۔ اور پھر وہ اس نعمت کو حاصل کرنے کیلئے ہزار جتن کرتا ہے۔ لیکن وہ نعمت نہیں ملتی۔

ٹانگ کی قیمت اب معلوم ہوئی:

بہت پہلے کی بات ہے۔ غالباً کبیروالے میں میرا ابتدائی دور تھا۔ یوں سمجھیں۔ کہ آج سے تقریباً ۴۵ یا ۴۶ سال پہلے کی بات ہے۔ میں لاہور دوستوں کے ہاں گیا۔ سلطان فاؤنڈری والوں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ بادامی باغ میں ایک بہت بڑی فیکٹری کا مالک تھا۔ اس کا تذکرہ آ گیا۔ تو سلطان فاؤنڈری والوں نے بتایا کہ یہ شخص بھی پیچھے امبالے کا ہے۔ اور یہ سلطان فاؤنڈری والے بھی امبالے کے ہیں۔ (امبالہ انڈیا کا ایک ضلع ہے)۔

کہتے ہیں کہ اس کے ایک بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور وہ یہاں کسی سے درست نہیں ہوئی۔ انگلینڈ بھی بھیجا۔ یہ شخص چونکہ بہت دولتمند ہے۔ تو یہ کہنے لگا۔ کہ "اگر کوئی بیٹے کی ٹانگ ٹھیک کر دے تو میں اس کو اپنے بیٹے کے برابر سونا تول کے دوں گا"

تو میں نے فوراً کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری دونوں ٹانگیں جو اس حالت میں ہیں ہمارے دگنے وزن سونے سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اگر ایک ٹانگ بھی اپنے برابر سونا دے کے نہیں ملتی۔ تو ہمیں تو اللہ نے دو دے رکھی ہیں۔ اور صحیح سالم ہیں۔ لیکن ہمیں اس نعمت کی قدر نہیں۔ اور اس نعمت کی قدر اس وقت ہوتی ہے۔ جب یہ نعمت چھن جائے۔ یا کوئی ایسا شخص سامنے آئے جس کے پاس وہ نعمت نہ ہو پھر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

پریشانیوں کی بنیادی وجہ

بلکہ یوں سمجھیں کہ اس میں ایک اور سبق بھی ہے، دنیا میں بہت زیادہ انسان غمزدہ ہوتے ہیں کسی ایسے خیال کی بناء پر کہ میرے پاس فلاں چیز نہیں ہے۔

- ایک آدمی ہے آپ اس کو غمزدہ دیکھو گے کہ میرے پاس کار نہیں۔ کار ہونی چاہیے۔

- ایک آدمی ہے اسکو آپ بہت زیادہ فکر مند دیکھو گے کہ میرے پاس مکان نہیں۔
- ایک آدمی کو آپ کو دیکھیں گے کہ وہ بہت زیادہ غمزدہ ہو گا کہ میرے پاس اولاد نہیں۔

کوئی کسی وجہ سے غمزدہ ہو گا۔ کوئی کسی وجہ سے فکر مند ہو گا۔ چونکہ اس بات کا حاصل کر لینا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اور کوئی دوسرا آپ کو لے کے دے سکتا نہیں۔ اس لیے وہ غم جان کو لگ جاتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی طبیب، آپ کو اس غم کا علاج نہیں دے سکتا۔

پریشانیوں سے نجات کا واحد حل:

اس کا علاج بھی شارع علیہ السلام نے اللہ کے فضل و کرم سے بتایا۔ وہ یہ ہے کہ ''دنیا میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے پہ نظر رکھا کرو۔ اوپر والے پہ نظر نہ رکھو۔ تمہارے اس غم کا حل ہو جائے گا۔ (مشکوۃ۔۱/ ۴۴۷۔ بخاری۔۲/۹۶۰۔ مسلم۔۲/ ۴۰۷)

بات مختصر قسم سی ہے لیکن بہت مؤثر ہے۔ اگر آپ اس کو یاد رکھ لیں۔ کہ دنیا میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو۔ اوپر والے کو نہ دیکھو۔ تمہارے غم کا علاج ہو جائے گا۔

آپ اپنے آپ کو کسی چیز میں محروم پاتے ہیں۔ لیکن آپ محروم ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں جس کے پاس وہ نعمت ہے۔ اور وہ آپ سے اس نعمت میں اوپر ہے۔ اس کی طرف نظر نہ لے جاؤ، نظر اس کی طرف لے جاؤ۔ جو کسی وجہ سے آپ سے نیچے ہے۔

آپ کے بدن پر دس روپے گز والا کپڑا ہے اور دوسرے نے ۱۰۰ روپے گز والا کپڑا پہن رکھا ہے۔ تو اگر آپ ۱۰۰ روپے گز کپڑے والے کی طرف دیکھو گے تو آپ کو غم ہو گا، صدمہ ہو گا کہ میرے پاس ۱۰ روپے والا ہے۔ میرے پاس ۱۰۰ روپے والا نہیں ہے۔ تو آپ اس کی طرف نہ دیکھیں۔ بلکہ آپ اس شخص کی طرف دیکھیں۔ جو

ننگے بدن پھر رہا ہے۔ اس کے بدن پر ۱۰ روپے گز والا کپڑا بھی نہیں ہے۔ تو پھر آپ اس بات پر خوش ہوں گے کہ دیکھو اللہ نے میرے اوپر کتنا احسان فرمایا ہے کہ اس کے پاس بدن ڈھانپنے کیلئے بھی کپڑا نہیں ہے۔ میرے پاس ہے تو سہی۔ چاہے ۱۰ روپے گز والا ہے۔

ایسے ہی ہر معاملے میں۔ اگر آپ کا مکان سادہ ہے۔ تو آپ کسی کی کوٹھی کی طرف نہ دیکھیں۔ اگر آپ کوٹھی کی طرف دیکھیں گے تو آپ کو غم ہوگا کہ میرے پاس کوٹھی نہیں ہے۔ بلکہ آپ اس کی طرف دیکھیں جو جھونپڑی میں رہتا ہے۔ کہ جھونپڑی کے مقابلے میں اللہ نے آپ کو کتنا اچھا مکان دے رکھا ہے۔ چاہے کچی اینٹوں کا ہی ہے۔

تو جس وقت دنیا میں آپ اپنے سے کم درجے کے شخص کی طرف دیکھو گے تو اس کے غم جو طاری ہوتے ہیں۔ کہ میرے پاس فلاں چیز نہیں ہے۔ فلاں چیز نہیں ہے۔ اس کا علاج اس طرزِ فکر کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اگر کسی کو اللہ یہ سوچ دے دے تو وہ شخص کبھی اس معاملے میں غمزدہ نہیں ہوگا۔

جس نعمت کے بھی فقدان کا خیال آپ کے دل میں آئے تو فوراً دوسری نعمت کا خیال کریں۔ کہ دیکھو فلاں کے مقابلے میں اللہ نے مجھے کتنا کچھ دے رکھا ہے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے یہ مختلف حالات اس طرح سے انسان کیلئے اصلاحِ خیال کا اور شکرِ خداوندی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ حکمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔

﴿آدمُ اِنّی اَحبَبتُ اَن اُشکرَ﴾

''آدم! میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر اداء کی جائے''

مطلب یہ تھا کہ اگر ہر کسی کو ہر نعمت دے دوں تو میری اس نعمت کا احساس کسی کو نہیں ہوگا۔ اور اس نعمت کے اوپر شکر کوئی اداء نہیں کرے گا۔ اور جب کسی کے پاس نعمت ہوگی، کسی کے پاس نہیں ہوگی۔ تو اس وقت نعمت کی قدر آئے گی۔ اور نعمت کی قدر کرنے

کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کا شکریہ اداء کرے گا۔

بنی آدم کے کانوں میں اللہ کی پہلی آواز:

یہ اس وقت واقعہ پیش آیا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ان کے سامنے موجود کیا تھا۔ اور بھی اس وقت بہت سارے واقعات پیش آئے۔ لیکن میرے موضوع سے تعلق ایک اور واقعہ کا ہے۔ جس کو قرآن کریم نے ذکر کیا کہ ساری اولاد کو موجود کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اجتماعی طور پر ایک سوال کیا تھا۔ اور وہ اللہ کی پہلی آواز ہے جو بنی آدم کے کانوں میں پڑی۔ وہ ہے۔

" اَلَستُ بِرَبِّکُم "

اللہ تعالیٰ نے آدم اور انکی اولاد کو خطاب کر کے کہا تھا، پوچھا تھا، سوال کیا تھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟۔ تو سب نے بالاتفاق جواب دیا تھا۔

" قَالُوا بَلٰی "(سورہ اعراف آیت ۱۷۲)

کیوں نہیں؟۔ تو ہمارا رب ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو اپنا پہلا پہلا تعارف جو کرایا۔ وہ اپنی ربوبیت کی صفت کے ساتھ کروایا۔ اور آپ کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ ہم نے اقرار کیا ہے کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ یہ ہمارے دل، دماغ میں بات ڈال دی۔

عقیدہ ربوبیت کی اہمیت:

پیدا ہونے کے بعد ہمارے سامنے اللہ کی کتاب قرآن کریم آپ کے پاس ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور سورہ فاتحہ کی پہلی آیت آپ کو بتاتی ہے۔

" اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین "

پہلی آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے جو اپنا تعارف کروایا تو "رب العالمین" کے لفظ کے ساتھ کروایا ہے۔ کہ اللہ رب العالمین ہے۔

اورآپ کے سامنے ہے کہ اللہ نے قرآن کریم کوسورہ ناس پر ختم کیا ہے اور اس میں بھی ہے

"قُل اَعُوذُبِرَبِّ النَّاسِ"

وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا تذکرہ کیا ہے۔

اور درمیان والی زندگی آپ نے کس طرح سے گذارنی ہے، آپ طالب علم ہیں۔آپ کیلئے اشارہ ہی کافی ہے۔قرآن کہتا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ استَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَیھِمُ المَلٰئِکَۃُ﴾

(سورہ فصلت. آیت. ۳۰)

جولوگ کہہ دیتے ہیں۔کہ ہمارارب اللہ ہے۔پھراس کے اوپر جمے رہتے ہیں۔ ڈٹے رہتے ہیں۔جب اللہ کورب کہہ دیا۔اسی پہ استقامت اختیار کرلی۔اس کے اوپر ڈٹ گئے۔اس عقیدے سے ہٹتے نہیں۔یہی ہیں۔جن کے اوپر اللہ کی رحمت کے فرشتے اترتے ہیں۔اوردنیاوآخرت میں ان کو بشارتیں دیتے ہیں۔

تو "ہمارارب اللہ ہے" اس عقیدے پر استقامت مطلوب ہے۔اور اس عقیدے پر جمنے کے نتیجے میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔تو یہ عقیدہ اتنا بنیادی اور اتنا اہم عقیدہ ہے۔

قبر میں ربوبیت کا سوال:

بلکہ اس سے تھوڑا سا آگے بڑھو۔آپ حضرات کو معلوم ہے۔کہ جب ہم مر جائیں گے۔اورمرنے کے بعد جس وقت قبر میں ہمارا محاسبہ شروع ہوگا۔توپرچے کا پہلا سوال کیا ہے؟

مَن رَبُّکَ.

تیرارب کون ہے؟

توسب سے پہلے یہی پوچھا جائے گا۔قبر میں تین ہی توسوال ہوں گے۔

قبر کے امتحان والا پرچہ آؤٹ:

ہمارے بعض بزرگ دلچسپی سے کہا کرتے ہیں کہ یہ عجیب امتحان ہے کہ جس کا پرچہ پہلے آؤٹ ہو گیا۔ جب یہاں کے امتحانوں کا پرچہ آؤٹ ہو جائے تو آپ بڑے خوش ہو جاتے ہیں کہ پتہ چل گیا کہ امتحان میں کون کون سا سوال آرہا ہے۔ اور وفاق کے امتحان میں اگر ایسا ہو جائے تو سارے ملک میں اودھم مچ جاتا ہے۔ کہ جی! فلاں جگہ پرچہ آؤٹ ہو گیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ نے برزخ میں، قبر میں جانے کے بعد جو پرچہ ہمیں دینا ہے۔ وہ آؤٹ ہو گیا ہے۔ اور بتا دیا ہے۔ اس میں تین ہی سوال ہیں۔

- پہلا سوال، مَنْ رَبُّكَ. تیرا رب کون ہے؟
- دوسرا سوال ہے۔ مَادِيْنُكَ۔ تیرا دین کیا ہے
- تیسرا سوال ہے۔ مَاتَقُوْلُ فِي هٰذَاالرجل۔ تو اس آدمی ﷺ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ (مشکوۃ ۱/۲۵۔ ابوداؤد ۲/۳۰۴)

قبر کے سوالات کا جواب کون دے سکے گا:

یہ تین سوال آپ کے پرچے میں آنے ہیں اور آپ کو پہلے بتا دیے گئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہاں آدمی جھوٹ نہیں بول سکے گا۔ وہاں آپ نے جواب دینا ہو گا اپنے اس حال کے مطابق جو دنیا میں گذارا ہے۔ اگر تو واقعی دنیا میں اللہ کو رب سمجھتے تھے تو کہہ سکو گے۔

رَبِّيَ اللّٰهُ.

اور اگر دنیا میں اللہ کو رب نہیں سمجھا تو وہاں یہ جواب نہیں دے سکو گے۔ یہ جواب جو آئے گا۔ آپ کے حال سے ناشی ہو گا۔

اور اسی طرح سے آپ نے دنیا کے اندر اپنا طریقہ اگر سرور کائنات ﷺ کے طریقے کے مطابق رکھا ہو گا۔ اور دین کے مطابق آپ چلے ہوں گے۔ تو آپ جواب دے سکیں گے۔

دِینِیَ الاِسلَامُ.

اور اگر آپ دنیا کے اندر اسلام کے مطابق نہیں چلے۔ اور آپ کی زندگی اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ تو آپ اس سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے۔ گویا کہ آپ کی زندگی کا عمل آپ کے اس سوال کا جواب ہے۔

اور اسی طرح سے سرورِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کو اگر آپ نے واقعتاً اللہ کا نمائندہ سمجھا ہوگا۔ کہ جو کچھ یہ بیان کریں کہ اللہ کے نزدیک یہ بات اچھی ہے تو آپ نے اسی کو اچھا سمجھا۔ اپنی طرف سے بدعات ایجاد نہیں کیں۔ بدعتیوں والی زندگی آپ نے اختیار نہیں کی۔ کہ خود ساختہ باتیں بنا کے سمجھتے رہے ہوں کہ یہ دین کی باتیں ہیں۔ ورنہ پھر آپ "محمد رسول اللہ" نہیں کہہ سکیں گے۔ "محمد رسول اللہ" آپ تب کہہ سکیں گے جس وقت آپ نے دنیا کے اندر اللہ کی بات حضور ﷺ کی وساطت لی گی۔

"محمد رسول اللہ" کا معنی یہی ہے کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ اللہ کی بات یہی بتائے گا۔ اور جو یہ بتائے گا وہی اللہ کی بات ہوگی۔ اگر تو اس طرح سے آپ نے اتباعِ سنت کی ہوگی کہ دین کا ہر مسئلہ حضور ﷺ سے لیا ہوگا۔ اسی طریقے کے مطابق جو آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ۔

- چاہے وہ عبارت النص سے ثابت ہو۔
- چاہے دلالت النص سے ثابت ہو۔
- چاہے اقتضاء النص سے ثابت ہو۔
- چاہے اشارۃ النص سے ثابت ہو۔
- چاہے قیاسِ صحیح سے ثابت ہو۔

تو احکام کے ثابت کرنے کیلئے جتنے طریقے چلتے ہیں۔ اور آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ تو اگر وہ مسئلہ حضور ﷺ کی وساطت سے آیا ہوگا۔ اور آپ نے قبول کیا ہوگا۔ تو

آپ کہہ سکیں گے۔ کہ میں اس کو اللہ کا رسول سمجھتا ہوں جو ہمارے پاس حق لے کے آیا تھا۔

اور اگر آپ نے اور طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ اپنے طور پر بدعتیں ایجاد کر کے ان کو دین سمجھ کر ان پر عمل کرتے رہے۔ اور یہ کہتے رہے کہ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ اچھا ہے۔ حالانکہ اللہ کے رسول نے نہیں بتایا۔ تو پھر آپ ''محمد رسول الله'' نہیں کہہ سکیں گے۔ تو ان تینوں سوالوں کے جواب آپ کی زندگی سے ملتے ہیں۔ کہ آپ نے زندگی کیسے گذاری؟۔

بہر حال ان سب باتوں سے معلوم یہ ہوا کہ سب سے زیادہ مضبوط عقیدہ انسان کا یہ ہونا چاہیے۔ کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ اور یہ جو میں نے ایت پڑھی تھی۔ اس میں بھی یہی ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وعظ کہتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُم فَاعْبُدُوهُ﴾

''اللہ ہی میرا رب ہے، تمہارا رب ہے تم اسی کی عبادت کرو۔''

''هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ'' (سورہ آل عمران آیت ۵۱)

''صراط مستقیم یہی ہے''۔

اس سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ کہ سورہ فاتحہ کے اندر آپ جو اللہ سے دعا کرتے ہیں۔

''اهدِ ناالصِّرَاط المُستَقِيم ''

اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم دکھادے۔ تو وہ صراط مستقیم یہی ہے۔ جو اس آیت میں مذکور ہے۔

سب سے بڑا فتنہ عقیدہ ربوبیت کے متعلق:

اس وقت اس کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ کہ حضور ﷺ کے بیان فرمانے کے مطابق اس دنیا میں سب سے بڑا امتحان اور آزمائش، فتنہ جو آنے والا

ہے۔قربِ قیامت میں (جیسا کہ آثار شروع ہو رہے ہیں..... بلکہ ہو گئے ہیں) سب سے بڑا فتنہ جو آنا ہے وہ اسی مسئلے سے متعلق ہے۔ جو ربوبیت سے تعلق رکھتا ہے، وہ سب سے بڑا فتنہ دجال کا فتنہ ہے۔ اور حدیث کی ہر کتاب کے اندر آپ پڑھتے ہیں۔ کہ دجال آئے گا۔ اور آ کے یہی دعویٰ کرے۔

''أَنَا رَبُّكُم''

تمہارا رب تو میں ہوں۔

آپ نے یہ بات سنی ہوئی ہے نا؟۔ (جی) تو آپ اس کو یاد کرو۔ کہ وہ دجال کہے گا تمہارا رب تو میں ہوں۔ اور پھر وہ اپنے کرشمے دکھائے گا۔ اس کو اس قسم کے تصرفات حاصل ہوں گے۔ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا ترقی یافتہ دور ہو گا اور ترقی کے راز اس کے پاس ایسے ہوں گے۔ کہ بارش اس کے اختیار میں ہوگی۔ جو چاہے گا بارش ہو گی۔ باقی سب چیزیں اس کے اختیار میں ہوں گی۔ زمین کے خزانے وہ نکالے گا۔ زمین کے خزانے اس کے ساتھ ایسے پھریں گے۔ جیسے مکھیاں اپنے سردار کے ساتھ پھرتی ہیں۔ (مسلم ۲/۴۰۱۔ مشکوۃ ۱/۴۷۳)

اور وہ کہے گا کہ روٹی اس کو ملے گی جس کو میں دوں گا۔ جس کو میں روٹی نہیں دوں گا وہ بھوکا مرے گا۔ جو مجھے رب مانے گا اسے روٹی ملے گی۔ جو مجھے رب نہیں مانے گا۔ اس کو روٹی نہیں ملے گی اور وہ بھوکا مرے گا۔ جیسے آہستہ آہستہ یہ امریکہ اور یورپ کی اقوام اسی بات کی طرف بڑھتی جا رہی ہیں کہ رزق کے اسباب کے اوپر ان کا کنٹرول ایسے ہوتا جا رہا ہے۔ کہ ان کا دماغ یہ بنتا جا رہا ہے کہ اب دنیا کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم جس کو چاہیں، خوشحال کر دیں۔ جس کو چاہیں، بدحال کر دیں۔ ربوبیت ہمارے لیے ہے۔

یہ بہت بڑا سخت امتحان ہے جو قیامت سے پہلے آنے والا ہے۔ حضور ﷺ نے بار بار اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ اس بات کو یاد رکھنا جو اس فتنے کا قائد ہو گا

وہ یک چشم ہوگا۔ اس کی ایک آنکھ ہوگی۔ وہ کانا ہوگا آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں اس دجال کا بہت تعارف کرایا ہے۔ کہ ایسا ہوگا۔ ایسا ہوگا۔ اگر وہ باتیں تمہیں یاد نہ رہیں۔ تو ایک بات نہ بھولنا۔ یہ موٹی سی بات یاد رکھنا۔

﴿اِنَّ رَبَّکُم لَیسَ بِاَعوَرَ﴾

''تمہارا رب کانا نہیں ہے۔'' (مشکوۃ ۱/۴۷۶۔ بخاری ۲/۶۳۲)

بس یہ بات نہ بھولنا۔ وہ کانا ہوگا اور تمہارا رب کانا نہیں ہے۔ اس لیے بھوکے مر جانا۔ اس کو رب نہ ماننا۔ بظاہر اس کے ساتھ جنت بھی ہوگی، دوزخ بھی ہوگی، جو اس کو رب کہے گا وہ اپنے طور پر اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ حقیقت میں وہ دوزخ ہوگی۔ اور جو اس کو رب نہیں کہے گا۔ اس کو وہ آگ میں پھینک دے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ حقیقت میں جنت ہوگی۔

(مشکوۃ ۱/۴۶۳۔ ابو داود ۲/۲۲۷)

اس لیے ایسے حالات اگر آپ کے سامنے آجائیں۔ تو آپ نے اس دجال کی جہنم میں چلے جانا ہے۔ اس دجال کی آگ میں جل جانا ہے۔ لیکن اس کو رب نہیں ماننا۔ جس قسم کی بھی وہ سختیاں کرے۔ اسکی بات نہیں ماننی۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کو وہ سر کے اوپر آری رکھ کے چیرے گا، دو ٹکڑے کرے گا۔ اس قسم کے ظلم وستم بھی کرے گا۔

لیکن یاد رکھنا۔ وہ رب نہیں ہے۔ وہ کانا ہے۔ رب کانا نہیں ہے۔ بس یہ بات کبھی نہ بھولنا۔

ربوبیت کی حقیقت:

تو یہ ربوبیت کے عقیدے کو اس لیے واضح کیا جا رہا ہے۔ کہ آنے والا فتنہ اسی مسئلے سے ہی متعلق ہے۔ کہ دجال نے آکے ربوبیت کا دعویٰ کرنا ہے۔ اب سوال ہوگا کہ ربوبیت آخر ہے کیا؟۔ رب کسے کہتے ہیں؟۔ اب دجال کے فتنے کو سامنے رکھ کے آپ کیلئے رب کا سمجھنا بڑا آسان ہوگیا۔

رب اصل میں اس کو کہتے ہیں۔ جو آپ کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ جو تمہیں پیدا کرتا ہے، پالتا ہے، تمہاری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ رب وہ ہے۔ اس لیے جھکنا اسی کے سامنے ہے۔ عبادت اسی کی کرنی ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ رَبِّی وَرَبُّکُم فَاعبُدُوہُ"

اور اگر کوئی دوسرا آ کے کہتا ہے کہ نہیں..... تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا میں ہوں، تمہاری ضرورتیں مجھ سے متعلق ہیں وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اور وقتی طور پر اللہ کی طرف سے آزمائش تو ہوسکتی ہے۔ کہ وقتی طور پر دوسرے کے ہاتھ میں اس قسم کے حالات آجائیں۔ جیسے دجال کے حالات آتے ہیں۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے سب اختیارات اللہ کے پاس ہیں۔ کسی دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنا کسی اور کے بس میں

اس لیے دجال کے فتنے میں روٹی کا مسئلہ اور ضروریات کے پورا ہونے کا مسئلہ یہ چونکہ اس دجال کے ہاتھ میں آجائے گا۔ اسکی قوم کے ہاتھ میں آجائے گا۔ رزق کی چابیاں اس کے پاس ہوں گی۔ ظاہری اسباب اس کے پاس ہوں گے۔ اس لئے لوگوں کو دھوکا دے گا کہ میں رب ہوں۔ جو مجھے سجدہ کرے گا، مجھے رب مانے گا، وہ خوشحال ہوگا۔ اور جو مجھے رب نہیں مانے گا وہ بدحال ہوگا۔

اب یہ حالات جو آپ کے سامنے آتے جا رہے ہیں۔ سرور کائنات ﷺ نے پوری تفصیل کے ساتھ ان کا تعارف کروایا ہے۔ کہ ایسے وقت میں اس بات کی زیادہ ضرورت ہوگی کہ تم کہو

"رَبُّنَا اللّٰہُ".

ہمارا رب تو اللہ ہے۔ اس لیے جو سختی آئے برداشت کرنی ہے۔ جیسی شدت آئے برداشت کرنی ہے۔ لیکن اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا کارساز نہیں ماننا۔ کسی کو قسمت سنوارنے والا قسمت بگاڑنے والا نہیں ماننا۔ یہ سب کے سب اختیارات اللہ کے پاس ہیں۔ یہ جو

کچھ ہوگا۔ وقتی طور پر ہوگا۔ اور ظاہری طور پر ایک دھوکا ہوگا۔ حقیقت کے اعتبار سے کچھ نہیں ہوگا۔ اور یہ فتنہ چندروز ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز جلدی مٹ بھی جائے گا۔

خلاصہ بیان

بہرحال اس عقیدے کی مضبوطی آج کل کے دور میں بہت ضروری ہے۔ کہ انسان اللہ کے علاوہ کسی دورے کواپنا کارساز نہ سمجھے۔

- موت وحیات اسی کے ہاتھ میں ہے۔
- رزق کے خزانے اسی کے ہاتھ میں ہیں۔
- عزت، ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔
- طاقت، قدرت اسی کے پاس ہے۔

اسی کوتوحید کہتے ہیں۔ اسی کوربوبیت کا عقیدہ کہتے ہیں۔ اگرکسی کے اوپر اتنا مسلط کرلیا جائے کہ انسان سمجھے کہ اگر میں نے اس کی مخالفت کی۔ تو میری روٹی، پانی بند کردے گا۔ یہ میری موت وحیات کا مالک ہے۔ یہ میری خوشحالی، بدحالی کا مالک ہے۔ یہ عقیدہ توحید کے خلاف ہے۔

توتوحید کا مضمون چونکہ آپ کے سامنے میں نے مختلف انداز میں ذکر کیا ہے۔ تو آج ذہن میں یہ بات تھی کہ اسی سلسلے میں اللہ کی ربوبیت کا عقیدہ بھی آپ کے سامنے واضح کردیا جائے۔ اب آپ سارے اپنی زبان سے کہو

"رَبُّنَا اللّٰہُ" ہمارارب اللہ ہے۔

بس وہی ہمارارب ہے۔ وہی ہمارا معبود ہے۔ اسی کی ہم نے عبادت کرنی ہے۔ کوئی دوسرا ہمارارب نہیں۔ ہم ہرکسی کی نفی کرتے ہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ رَبِّی وَرَبُّکُم فَاعبُدُوہُ. ھٰذَا صِرَاطٌ مُستَقِیم"

سبحانك اللهم وبحمدك اشهدان لااله الا انت استغفرك واتوب اليك.

❀❀❀

قرآن ایک عظیم معجزہ

بمقام: اقراء روضۃ الاطفال کراچی

بر موقع: ختم قرآن کریم

بتاریخ: ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء بمطابق ۲۲ شعبان ۱۴۲۸ھ

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ وَ قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم

مَا مِنَ الْاَنْبِیَاءِ نَبِیٌّ اِلَّا قَدْ اُعْطِیَ مِنَ الْاٰیَاتِ مَا مِثْلُہٗ اٰمَنَ عَلَیْہِ الْبَشَرُ وَ اِنَّمَا کَانَ الَّذِیْ اُوْتِیْتُ وَحْیًا اَوْحَی اللّٰہُ اِلَیَّ وَ اَرْجُوْ اَنْ اَکُوْنَ اَکْثَرَھُمْ تَابِعًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (مشکوۃ. ۱/۵۱۱. بخاری. ۲/۷۴۴. مسلم/۸۶)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰالِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

معجزاتِ انبیاء کا تذکرہ:

سرورِ کائنات ﷺ کا یہ قول مبارک جو آپ کے سامنے پڑھا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ کوئی نبی نہیں آیا۔ مگر اللہ نے اس کو ایسا معجزہ اور ایسی چیز ضرور دی ہے جس پر اعتماد کر کے لوگ ایمان لائے۔ اور مجھے جو اللہ نے معجزہ عطا فرمایا۔ وہ وحی ہے جو اللہ نے میری طرف بھیجی۔ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ پیروی کرنے والے لوگ میرے ہوں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ﷺ کو معجزات عطاء فرمائے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اور ان معجزات کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ سے اونٹنی پیدا کر دی۔ حضرت موسیٰ [illegible] کا تفصیل کے ساتھ قرآن کریم میں ذکر ہے۔ عصائے موسیٰ کا ذکر ہے۔ ید بیضاء کا ذکر ہے۔ تِسعَ آیات کے تحت ان معجزات کو نمایاں کر کے ذکر کیا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ احیائے موتیٰ۔ ابراءِ اکمہ۔ یعنی اندھوں کو سوا کھا کر دینا۔ اور کوڑیوں کو ٹھیک کر دینا۔ یہ معجزات ہیں جو قرآن کریم میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ باقی انبیاء ﷺ کو بھی یقیناً معجزات دیے گئے۔ لیکن ان کی زیادہ تفصیل قرآن کریم میں نہیں ہے۔

باقی انبیاء کے معجزے عملی تھے:

اس زمانے میں ان معجزات سے لوگوں نے ان کو پہچانا۔ اور ان پر اعتماد کر کے ان پر ایمان لائے۔ لیکن ان معجزات کی حیثیت ایک عملی معجزے کی ہے۔ عمل جو ہوتا ہے وہ عامل کے ساتھ باقی ہوتا ہے۔ جب عامل چلا گیا۔ تو ساتھ ساتھ عمل بھی چلا گیا۔

اس لیے آج حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ہم کسی کو آنکھوں سے دکھا نہیں سکتے۔ کوئی یہودی ہمارے سامنے آ کے کہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ ہم کہیں گے۔

برحق۔ انکار نہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عصا کا معجزہ عطاء فرمایا تھا۔ کہ وہ عصا ڈالتے تھے تو اژدھا بن جاتا تھا۔ یہ بالکل برحق ہے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ید بیضاء کا معجزہ دیا تھا کہ بغل میں ہاتھ ڈال کے نکالتے تھے تو ہاتھ روشن ہو جاتا تھا۔ یہ معجزہ بھی برحق ہے۔ اور قرآن کریم میں مذکور ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص جو موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مانتا نہ ہو۔ آج کسی یہودی سے مطالبہ کرے۔ کہ آپ کہتے ہیں۔ کہ ہمارے نبی کو اللہ نے عصا کا معجزہ عطاء فرمایا تھا۔ ذرا ہمیں دکھاؤ کہ وہ کیا ہے؟ ید بیضاء کا معجزہ ہمیں دکھاؤ۔ تاکہ ہم بھی دیکھ لیں کہ ید بیضاء والا معجزہ واقعی تھا۔ لیکن دنیا کا یہودی اکٹھا ہو کر بھی اس معجزے کو آج نہیں دکھا سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام گئے تو ساتھ ہی معجزات بھی چلے گئے۔

- کتابوں میں مذکور ہیں۔
- ہم پڑھتے ہیں۔
- ایمان لاتے ہیں۔

باقی کسی یہودی کے بس میں نہیں کہ یہ معجزہ دکھا سکے۔

آج کوئی عیسائی آئے اور کہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا تھا۔ کہ اندھوں کو سوا کھا (بینا) کر دیتے تھے۔ کوڑیوں کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ ہم کہتے ہیں۔ برحق۔ لیکن اگر کوئی شخص منکر ہو۔ اور وہ کہے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیتے ہو۔ اور ان کے معجزات کا تذکرہ کرتے ہو۔ آج ہمیں عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی معجزہ دکھاؤ تو سہی۔ تو کسی عیسائی کے بس میں نہیں۔ پوری دنیا کے عیسائی اکٹھے ہو جائیں۔ لیکن وہ آج ان معجزات کو ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں لا سکتے۔ اور ہمیں دکھا نہیں سکتے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات:

یہ ہیں عملی معجزات۔ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے عملی معجزات بھی بے شمار دیے۔ کتابوں میں مذکور ہے۔ کہ رسول اللہ صلی علیہ سلم کے تقریباً ۱۰۰۰ معجزات

ہیں جن کو ہم عملی معجزات کہہ لیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطاء فرمائے۔ اس جہان میں کوئی چیز ایسی نہیں۔ جس کے اندر حضور ﷺ کے معجزات کا ظہور نہ ہوا ہو۔

- آپ کے معجزات کا ظہور پہاڑوں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور سمندروں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور درختوں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور بادلوں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور سورج میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور چاند میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور آگ میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور پانی میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور پتھروں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور جنوں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور آسمانوں میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور زمین میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور نباتات میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور حیوانات میں ہوا۔
- آپ کے معجزات کا ظہور جمادات میں ہوا۔

غرض ہر چیز میں ہمارے پیغمبر کے معجزات کا ظہور ہوا۔ اور ان سے روایتیں بھری پڑی ہیں۔ اور یہ سارے کے سارے عملی معجزے ہیں۔ جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ آج ہم بھی رسول اللہ ﷺ کے یہ معجزات مخلوق کو دکھا نہیں سکتے۔

ہمارے نبی کا معجزہ آج بھی موجود:

لیکن اس حدیث میں معجزے کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے کسی عملی معجزے کا

ذکر نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ مجھے جو اللہ نے معجزہ دیا ہے۔ وہ وحی ہے۔ جو اللہ نے میری طرف بھیجی۔ اور یہ وحی ایک ایسا معجزہ ہے کہ آج ..... کوئی کافر .... کوئی مشرک ..... کوئی بے دین ..... ہم سے کہے۔ کہ تم اپنے نبی کا کوئی معجزہ دکھاؤ۔ تو ہمارے پاس

- ایک نہیں۔
- دس نہیں۔
- سینکڑوں نہیں۔
- ہزاروں نہیں۔
- لاکھوں نہیں۔

کروڑوں کی تعداد میں رسول اللہ ﷺ کا معجزہ دکھانے کیلئے موجود ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے جنہوں نے آپ کے سامنے قرآن کریم پڑھا ہے۔ ایک ایک بچہ رسول اللہ ﷺ کے معجزے کا نمونہ ہے۔ یہ معجزہ جو اللہ نے آپ کو دیا یہ علمی معجزہ ہے۔ اور اس معجزے نے قیامت تک باقی رہنا ہے۔ کیونکہ آپ کی نبوت بھی قیامت تک جاری رہے گی۔ اور آپ پر ایمان لانے کی دعوت بھی قیامت تک جاری رہے گی۔ تو آپ کی نبوت کے ثبوت کیلئے اس معجزے کو بھی قیامت تک باقی رکھا گیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس معجزے کو نہیں مٹا سکتی۔ سارے کافر اکٹھے ہو جائیں تو بھی اس کو نہیں مٹا سکتے۔

اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک ایسا معجزہ دیا گیا۔ کہ جس کی خصوصیات جن سے معلوم ہو کہ یہ معجزہ کسی اور کے پاس نہیں۔ اور کوئی اس کی مثال نہیں لا سکتا۔ اس کے اہل علم کے نزدیک بہت پہلو ہیں۔ لیکن اس کے معجزہ ہونے کی سب سے بڑی اور واضح دلیل جو ہر آدمی دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی کتاب ..... غیر زبان لیں ..... اور متشابہات سے بھری ہوئی ..... یہ بچے جو اردو کا ایک رسالہ زبانی یاد کر کے نہیں سنا سکتے۔ ان بچوں کے سینوں کے اندر اللہ نے اس کتاب کو محفوظ کیا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا

بہت واضح اور نمایاں معجزہ ہے۔ جو اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

قرآن دھل نہیں سکتا:

اس لیے یہ کتاب جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سینوں میں اتار دی۔ اس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا۔

((وَاَنزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ مَاءٌ))

''میں نے تیری طرف ایسی کتاب اتار دی۔ جس کو پانی نہیں دھو سکتا۔''

اگر یہ قلموں کے ساتھ کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی۔ تو آپ کہہ سکتے تھے کہ اس کو پانی میں ڈال دو۔

- یہ خراب ہو جائے گی۔
- اس کی سیاہی اتر جائے گی۔
- یہ کاغذ سفید رہ جائے گا۔

لیکن یہ کتاب قلم سے لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ کاغذوں میں لکھی ہوئی نہیں ہے۔ یہ جس وقت ان بچوں کے سینے کے اندر محفوظ کر دی گئی۔ تو اب یہ سارا دن دریا میں نہاتے رہیں۔ نہر میں نہاتے رہیں۔ بالٹیوں کے حساب سے پانی پیتے رہیں۔ لیکن آج تک کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ کہ ان کے سینے سے قرآن کا ایک حرف بھی کبھی مٹا ہو۔ ''بسم اللہ'' کی ''ب'' بھی مٹی ہو۔ یہ نظارہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

((تَقرَءُهُ نَائِمًا وَيَقظَانَ))

یہ کتاب ایسی ہے جس کو تو سویا ہوا بھی پڑھے گا اور جاگتا ہوا بھی پڑھے گا۔

(مشکوۃ۔۱/۴۶۰۔ مسلم۔۲/۳۸۵)

اور یہ نمونہ بچوں کو پڑھانے والے ہر روز دیکھتے ہیں۔ کہ جو بچے دن کو جاگتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ وہ رات کو سوئے ہوئے بھی منزل پڑھتے ہیں۔ اساتذہ کے سامنے اس قسم کی بیسیوں مثالیں ہوں گی۔

قرآن مردہ بھی پڑھتا ہے:

یہ روایت جب مشکوٰۃ میں آئی تو اس کے اوپر مشکوٰۃ کے شارح ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ میں لکھتے ہیں کہ "نائم اور یقظان تو پڑھتے ہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ "حیًّا و میتًا" بھی انسان اس کو پڑھتا ہے۔ زندہ بھی اور وفات پانے کے بعد بھی انسان اس کو پڑھتا ہے۔ اور پھر ایک واقعہ لکھا۔

واقعہ نمبر ۱

اور حدیث میں بھی اس بارے میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص نے خیمہ لگایا۔ اس کو پتہ نہیں تھا۔ کہ نیچے قبر ہے۔ وہ خیمے میں تھا۔ اچانک زمین سے قرآن کریم پڑھنے کی آواز آنی شروع ہو گئی۔ اور سورہ تبارک الذی پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ تو آپ نے تائید فرمائی۔ کہ یہ سورۃ انسان کو قبر میں اس کے کام آتی ہے۔ اور اس کو عذاب قبر سے بچاتی ہے۔

(مشکوٰۃ۔ ۱/۱۸۷۔ ترمذی۔ ۲/۱۱۷)

گویا کہ دفن ہونے کے بعد قبر سے قرآن کریم کی آواز کا آنا۔ یہ حدیث میں مذکور ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔

واقعہ نمبر ۲

تو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک استاد اور شاگرد آپس میں دور کیا کرتے تھے۔ دس آیتیں وہ پڑھتا۔ پھر دس آیتیں وہ پڑھتا۔ جس طرح سے دور کرنے والے کیا کرتے ہیں۔ استاد کی وفات ہو گئی۔ تو شاگرد استاد کی قبر پہ گیا۔ جب جا کر اپنے استاد کے ایصال ثواب کیلئے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ جب دس آیتیں پوری ہو گئیں۔ تو قبر سے استاد کی آواز آنی شروع ہو گئی۔ پھر وہ چپ ہوئے۔ پھر انہوں نے پڑھا۔ پھر وہ چپ ہوئے۔ پھر انہوں نے پڑھا۔ کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر اس شاگرد نے لوگوں کے سامنے اس کا اظہار کر دیا تو یہ فضیلت ختم ہو گئی۔

(مرقاۃ المفاتیح۔۱۵/۳۱۵)

تو ''حیًّا و میّتًا'' بھی انسان اس کو پڑھتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی پڑھتا ہے۔ اور زندگی میں بھی پڑھتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی پڑھتا ہے۔ اور مرنے کے بعد پڑھنے کی آواز باہر بھی آسکتی ہے۔

زندہ مثال

پچھلے دنوں آپ نے دیکھا ہوگا۔ ہمارے ہاں تو اخبار میں آیا تھا۔ بلکہ ان دنوں میں کراچی آیا تو یہاں بھی میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔ کہ یہ بچے جو مدرسہ حفصہ میں شہید ہوئے۔ لال مسجد میں شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فضیلت کو لوگوں کے سامنے نمایاں کیا۔ مقبولیت کے آثار ان پر نمایاں ہوئے

مقبولیت کے آثار میں سے قبروں سے خوشبو کا آنا ایک مستقل علامت ہے۔ اور اسی طرح مقبولیت کے آثار میں سے قبروں سے قرآن کریم پڑھنے کی آواز لوگوں کا سننا ایک مستقل فضیلت ہے۔ یہ بات آپ کے سامنے آئی۔ اور خوشبو سونگھنے والے تو شاید آپ میں سے بھی بیسیوں موجود ہوں گے جو وہاں گئے ہوں۔ اور انہوں نے خوشبو کو سونگھا ہو۔ یہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت میں سے تھی۔

اور ایک نمایاں علامت یہ ہے کہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دل میں ان کی محبت اتنی ڈال دی۔ کہ ہر آدمی ان پہ رشک کرتا ہے اور ان کی تعریف کرتا ہے۔ یہ محبت کا دلوں میں آجانا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ کہتا ہوں۔ کبھی ان کے خلاف زبان نہ کھولو۔ جو ہوا........ جیسا کیسا ہو..... لیکن ان کی مقبولیت اتنی نمایاں ہے کہ کوئی اندھا بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ تو ان کی قبروں سے قرآن کریم کی آواز آنے کا ذکر آپ کے سامنے آیا۔ تو جس سے معلوم ہوا کہ آدمی اس کو

۞ ''حیًّا'' بھی پڑھتا ہے۔

- "مُتِنًا" بھی پڑھتا ہے۔
- "نَائِمًا" بھی پڑھتا ہے۔
- "یقظان" بھی پڑھتا ہے۔
- بیدار بھی اس کو پڑھتا ہے۔
- سویا ہوا بھی اس کو پڑھتا ہے۔
- پانی اس کو نہیں دھو سکتا۔

حفاظ کو مبارک باد:

تو یہ بچے جو حفظ کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ یوں سمجھو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے۔ یہ اتنے قیمتی بچے ہیں۔ کہ اللہ کی امانت ان کے سینے میں ہے۔ اور ان کے ذریعے سے قیامت تک یہ قرآن باقی رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو مٹا نہیں سکتی۔

مبارک باد دیتا ہوں۔ ان بچوں کو .... ان کے والدین کو ...... ان کے اساتذہ کو .... اللہ ان سب کو جزائے خیر دے۔ اور ہمیں اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

قرآن کے خلاف پروپیگنڈہ

یہ لوگوں نے جو غلط مشہور کرنے کی کوشش کی۔ جو کہ قرآن کریم کے خلاف ایک تحریک ہے۔ کہ یہ سمجھ میں نہ آئے تو پڑھنے کا کیا فائدہ؟۔ یہ جو نعرہ لگاتے ہیں۔ اور جدید تعلیم یافتہ اس نعرے سے متاثر ہے۔ کہ طوطے کی طرح رٹنے کا کیا فائدہ؟

ان کا مقصد آپ کو یہ ترغیب دینا نہیں کہ سمجھ کے پڑھو بلکہ ان کا مقصد آپ سے قرآن چھڑانا ہے۔ کہ اس کو چھوڑ دو۔ جب سمجھ میں نہیں آتا۔ تو فائدہ کیا؟۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر اس اصول کو مان لیا جائے۔ تو کیا یہ بچے قرآن کریم کو یاد کرلیں گے؟۔ کیا یہ بچے قرآن سمجھتے ہیں؟۔ اور حفظ کا تو زمانہ ہے ہی وہی جب قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جب سمجھ میں آنے لگ جائے تو یہ یاد ہی نہیں ہوتا۔ (الا ماشاء اللہ)

حضرت سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کا حافظہ ایک بہت بڑی کرامت تھی۔ لیکن

قرآن کے حافظ نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے جب تلاوت کرنے بیٹھتا ہوں۔ تو جب معنی کی طرف توجہ ہوتی ہے تو اتنے مضامین ذہن میں آتے ہیں کہ آگے تلاوت نہیں ہوتی۔ تو یہ کتاب بے سمجھی کے زمانے کے ہی پڑھنے کی ہے۔

قرآن کا امتیازی وصف:

اصل میں دنیا میں واحد یہ کتاب ہے۔ کہ جس کے الفاظ بھی مقصود ہیں۔ باقی ہر کتاب کا معنی مقصود ہوتا ہے۔ الفاظ مقصود نہیں ہوتے۔ اس لیے حدیث شریف کا اردو ترجمہ بھی حدیث کہلائے گا۔ لیکن قرآن کریم کا اردو ترجمہ قرآن نہیں کہلاتا۔

اور اسی لیے اگر کوئی شخص نماز کے اندر اردو ترجمہ پڑھے تو نماز نہیں ہوگی۔ قرآن کریم کے الفاظ اور ان الفاظ کے اندر جو مفہوم ہے۔ تو لفظ اور معنی دونوں مل کے قرآن بنتے ہیں۔ تو صرف اس کتاب میں الفاظ بھی مقصود ہیں۔

اس لیے اس کے الفاظ کو پڑھنا ایک مستقل عبادت ہے۔ اور اس کے معنی کو سمجھنا یہ ایک مستقل چیز ہے۔ قرآن سمجھ کے پڑھو یا بے سمجھی سے پڑھو۔ دونوں صورتوں میں اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اور اس کتاب ہدایت کی حفاظت ذریعہ یہی ہے۔ کروڑوں حافظ ایسے ہیں۔ جو صرف حافظ ہیں۔ اس کا ترجمہ نہیں جانتے۔ لیکن اب رمضان شریف آنے والا ہے۔ تو آپ کے سامنے نمایاں ہوگا۔ کہ دنیا میں جتنی یہ کتاب پڑھی جاتی ہے۔ کوئی اور کتاب ایسی نہیں جو اس طرح سے پڑھی جاتی ہو۔ یہ رمضان شریف اس کی بہار کا مہینہ ہوتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت اور بہت بڑی امانت ہے جو بچوں کے سینوں میں اتار دی۔ اور ہمارے نزدیک یہ بچے قابل قدر ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس امانت کی حفاظت کا ذریعہ بنایا۔ ان کو بھی اللہ صحت وسلامتی سے رکھے۔ اور ہمیں بھی صحت وسلامتی سے رکھے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله. رب العالمین.

عظمتِ قرآن

بمقام: جامعہ عمر فاروق۔سمندری

برموقع: تقریب ختم قرآن کریم

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.
اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾ سورہ ضحی آیت ۱۱

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

محسن کی تعریف شکر کی ادائیگی

میں نے جو آیت آپ کے سامنے پڑھی۔ یہ سورہ والضحیٰ کی آخری چھوٹی سی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ سرور کائنات ﷺ سے کہتے ہیں۔

"وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ"

اے میرے محبوب! اپنے رب کی نعمت کو بیان کریں۔ اللہ نے جو آپ پر انعام کیا ہے، جو نعمت آپ کو عطاء فرمائی ہے۔ اس نعمت کو بیان کریں۔

اس لیے تحدیث بالنعمۃ شکر اداء کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ تحدیث بالنعمۃ یعنی نعمت کو بیان کرنا، اللہ کے احسان کا تذکرہ کرنا، کہ اللہ نے میرے پہ یہ احسان کیا ہے۔ اللہ نے میرے پہ یہ احسان کیا ہے۔ یہ اللہ کی نعمت کے شکر اداء کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

کوئی بندہ بندے پہ احسان کرے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ سلم کی تعلیم یہ ہے کہ احسان کرنے والا تو ذکر نہ کرے کہ میں نے یہ احسان کیا ہے۔ اگر احسان کرنے والا احسان جتائے گا تو احسان کا ثواب باطل ہو جائے گا۔ البتہ جس پر احسان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق حکم ہے کہ وہ اپنی زبان پر لائے کہ میرے پہ فلاں نے یہ احسان کیا۔ اللہ اس کو اچھا بدلہ دے۔ اس کے لیے دعا کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((مَنۡ اَثۡنٰی فَقَدۡ شَكَرَ وَمَنۡ كَتَمَ فَقَدۡ كَفَرَ))

جو احسان کرنے والے کی تعریف کرتا ہے۔ اس نے اس احسان کا شکریہ ادا کر دیا۔ اور جو کوئی احسان کو چھپالے، بتاتا ہی نہیں کہ میرے پہ کسی نے احسان کیا ہے یا کیا احسان کیا ہے؟۔ تو اس نے اس احسان کی ناشکری کی۔

(مشکوۃ ۱/۲۶۱۔ ترمذی۔ ۲/۲۳)

تو احسان کا تذکرہ کرنا یہ احسان کے شکر اداء کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ویسے تو

اللہ کی نعمتیں انسان کے اوپر بے شمار ہیں۔ جن کا کوئی حد حساب نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں۔

﴿اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (سورہ نحل آیت ۱۸۔ سورہ ابراھیم آیت ۳۴)

''کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔''

تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات اتنے ہیں۔

اس لیے اللہ کے شکر اداء کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان یوں کہے کہ اے اللہ! میرے پاس جو کچھ ہے سب تیرا ہی دیا ہوا ہے۔ میرے استحقاق کے بغیر دیا ہے۔ میں تو مستحق نہیں تھا۔ لیکن تو نے میرے پہ انعام کیا۔

- تو نے مجھے دولت دی۔
- تو نے مجھے اولاد دی۔
- تو نے مجھے علم دیا۔
- تو نے مجھے صحت دی۔
- تو نے مجھے عزت دی۔
- تو نے مجھے مال دیا۔

جو کچھ بھی ہے سب تیرا احسان ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر اداء کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اداءِ شکر کا طریقہ بفرمانِ الٰہی:

اسرائیلی روایات میں آتا ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ ''یا اللہ! تیری نعمتوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ تو میں تیری کس کس نعمت کا شکر اداء کروں۔ اور اگر کسی نعمت پر کوئی شکر کا کلمہ کہنے کی توفیق ہو جائے تو یہ تیرا مستقل احسان ہے۔ اس کا بھی مجھے شکر اداء کرنا چاہیے۔ تو تیرے شکر اداء کرنے والی ذمہ داری پہ میں کیسے پورا تر سکتا ہوں۔

یعنی ایک تو ویسے تیری نعمتیں ان گنت۔ اور اگر کسی نعمت پر کلمہ شکر کہنے کی توفیق ہو جائے تو یہ مستقل نعمت ہے۔ کہ تو نے احسان فرمایا کہ کلمہ شکر زبان سے اداء کرنے کی توفیق دے دی۔ تو اس پر بھی شکر واجب ہے۔ تو تیرا شکر اداء کرنے کا کیا طریقہ ہے؟۔

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اے موسیٰ! جو آدمی دل سے یہ جان لے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ میرا دیا ہوا ہے۔ اس نے میرا شکر اداء کر دیا۔ جو دل سے جان لے کہ میرے پاس جو کچھ ہے میرا استحقاق نہیں ہے۔ اس نے میرے اوپر رحمت فرما کے مجھے دیا ہے۔ تو میرا شکر اداء کرنے کیلئے یہ کافی ہے۔ (ھو مروی عن الحسن البصری انظر الدر المنثور ۱/۷۷۔شعب الایمان ۴۵۵۸)

اداءِ شکر کا طریقہ بفرمانِ نبوی:

سردار کائنات ﷺ کی حدیث ہے کہ جو شخص صبح، شام یہ کلمات پڑھ لے۔ اس نے اس دن کی اللہ کی نعمتوں کا شکر اداء کر دیا

"اَللّٰھُمَّ مَا اَصبَحَ بِی مِن نِعمَۃٍ اَوبِاَحَدٍ مِن خَلقِکَ فَمِنکَ وَحدَکَ لَا شَرِیکَ لَکَ"

یہ کلمات جو پڑھ لیتا ہے۔ جس دن پڑھ لے۔ اس دن کا شکر اس نے اداء کر دیا۔ (مشکوۃ۔۱/۲۱۱۔ابوداؤد۔۲/۳۳۶)

ان کلمات کا معنی یہی ہے۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا تھا۔ اے اللہ! جو نعمت بھی میرے پاس ہے۔ صرف میرے پاس نہیں۔ مخلوق میں سے کسی کے پاس ہے۔ وہ تیری طرف سے ہے۔ نعمت دینے میں، احسان کرنے میں تو اکیلا ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ جو شخص یہ کلمہ ہر روز صبح تین دفعہ پڑھ لے تو سردار کائنات ﷺ فرماتے ہیں۔ کہ اس دن کا اس نے شکر اداء کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں:

تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو بے شمار ہیں۔ کس کس پہ انسان شکر اداء کرے۔ لیکن اللہ

کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت۔ اللہ کے نزدیک، اللہ کے رسول کے نزدیک
(کیونکہ ہماری عقل تو ہمیں مختلف رستے دکھاتی ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ

- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ دولت مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ مربع مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ کارخانہ مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اچھی سواری مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اچھی کوٹھی مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اچھا کھانا مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ حکومت مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اقتدار مل جائے۔
- سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ سونا مل جائے۔

اگرچہ یہ بھی بڑی بڑی نعمتیں ہیں۔ اس کا انکار نہیں۔ لیکن یہ ساری کی ساری نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر کدورت ہے۔ یہ باعثِ راحت بھی ہوسکتی ہیں۔ باعثِ تکلیف بھی ہوسکتی ہیں۔

- دولت آپ کے لیے مفید بھی ہوسکتی ہے۔ اور دولت آپ کے گھر ڈاکو کو بلا کے آپ کی جان بھی لے سکتی ہے۔
- کار آپ کیلئے مفید بھی ہوسکتی ہے۔ کہ اس کے ساتھ آپ کا سفر جلدی طے ہوتا ہے۔ لیکن یہی کار کسی درخت سے ٹکرا کر آپ کی جان بھی لے سکتی ہے۔

اور ایسے ہی دنیا کی دوسری نعمتیں ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے۔ بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس میں یہ کدورت موجود ہے۔ یہی بدہضمی کا باعث بن کے آپ کو ہیضے میں مبتلا کردے۔ یہی لقمہ آپ کے گلے میں اٹک جائے تو آپ کی جان لے لے۔ اور اسی کے ناموافق ہونے کی بناء پر آپ بیسیوں بیماریوں میں

مبتلا ہو جائیں۔ ایسے ہوتا ہے کہ

- فلاں چیز کھائی تھی۔ اس لیے نزلہ ہو گیا۔
- فلاں چیز کھائی تی۔ اس لیے بدہضمی ہو گئی۔
- فلاں چیز کھائی تھی۔ اس لیے ہیضہ ہو گیا۔
- فلاں چیز کھائی تھی۔ اس لیے بخار ہو گیا۔
- فلاں چیز کھائی تھی۔ اس لیے سر میں درد ہو گیا۔
- فلاں چیز کھائی تھی۔ اس لیے پیٹ میں درد ہو گیا۔
- فلاں چیز کھائی تھی۔ اس لیے فلاں بیماری آ گئی۔

تو یہ نعمتیں جتنی بھی ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی کدورت ضرور ملی ہوئی ہے۔ یہ خالص نہیں ہیں۔

سب سے بڑی نعمت:

خالص نعمت وہ ہے۔ جس میں رحمت ہی رحمت ہو۔ اور اس میں وبال کا کوئی پہلو نہ ہو۔ نہ دنیا میں، نہ آخرت میں۔ کیونکہ دنیا کی جتنی نعمتیں ہیں اگر آپ نے ان سے دنیا میں راحت اٹھائی بھی سہی۔ تو جو آخرت میں ان کا حساب دینا پڑے گا۔ کہ

- کیا حلال سے حاصل کی تھی؟۔
- کیا حاصل کرنے کے بعد اس کو حلال طریقے سے استعمال کیا تھا؟۔
- کیا اس کو استعمال کرنے کے بعد جو قوت حاصل ہوئی تھی۔ اس سے کوئی اللہ کی نافرمانی تو نہیں کی تھی؟۔

یہ سارے حساب دینے پڑیں گے۔ اس لیے دنیا میں اگر کوئی چیز وبال کا باعث نہ بھی بنے تو قبر میں، حشر میں، آخرت میں، جس وقت جا کے ان کا حساب ہو گا تو مشکلات کا باعث بن سکتی ہے۔

لیکن ایک اللہ کی ایسی عظیم نعمت ہے۔ کہ جس کے مقابلے میں کوئی دسری نعمت

نہیں۔ اور وہ ہر قسم کے وبال سے خالی۔

- دنیا میں بھی باعثِ راحت۔
- قبر میں بھی باعثِ راحت۔
- آخرت میں بھی باعثِ راحت۔

اور دنیا کی کوئی نعمت اس کے مقابلے میں نہیں آسکتی۔ اگر آپ ایمانی نور کے ساتھ دیکھیں گے تو آپ کو اس دنیا کے اندر سب سے بڑی نعمت اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید نظر آئے گی۔ یہ سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

اللہ نے کتابیں اتاریں۔ ان سب میں سے یہ افضل ترین کتاب ہے۔

- تورات سے افضل۔
- زبور سے افضل۔
- انجیل سے افضل۔
- صحفِ انبیاء جتنے بھی ہیں، سب سے افضل۔

اللہ کے بے شمار فرشتے ہیں۔ لیکن ان فرشتوں میں سے سب سے افضل فرشتہ جبرئیل ہے۔ اور یہ کتاب اسی جبریل افضل فرشتے کی وساطت سے اتاری گئی۔

اللہ کے بہت سے رسول ہیں لیکن سب رسولوں میں سے افضل رسول محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہ کتاب اسی افضل رسول پر اتاری۔

دنیا کی زمین کے بے شمار خطے ہیں لیکن افضل ترین خطہ وہ ہے۔ جہاں بیت اللہ ہے۔ یعنی مکہ معظمہ۔ تو اس کتاب کو اس خیر البلاد میں اتارا۔

سال کے بارہ مہینے ہیں۔ ان سب میں سے افضل مہینہ رمضان المبارک ہے۔ یہ کتاب اس افضل مہینے میں اتاری۔

اور سال کی تمام راتوں میں سے سب سے افضل رات لیلۃ القدر تو یہ کتاب اسی افضل رات میں اتاری۔ تو

- افضل کتاب۔
- افضل فرشتے کی وساطت سے۔
- افضل رسول پر۔
- افضل زمین پر۔
- افضل مہینے میں۔
- افضل رات میں اتاری۔

جتنی فضیلتیں آپ سوچ سکتے ہیں۔ وہ ساری کی ساری فضیلتیں اس کتاب کیلئے ثابت ہیں۔ اور پھر جیسے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے چلی۔ ویسے ہی ہم تک پہنچی۔

حضور ﷺ کے تبرکات کی قدر:

کہتے ہیں کہ دہلی میں کچھ تبرکات تھے۔ جن کو لوگ منسوب کرتے تھے کہ یہ سرور کائنات ﷺ کے ہیں۔ جس طرح لاہور میں شاہی مسجد میں آپ [illegible] تبرکات پڑے ہیں۔ جن کے متعلق لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ حضور ﷺ کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ اویس قرنی رحمۃ اللہ کا دانت ہے۔ اس طرح سے مختلف چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ سلم کی کوئی چیز ہو۔ جو آپ کے استعمال میں آئی ہے۔ ہمارے لیے بہت بڑا تبرک ہے۔ مل جائے تو اس کو ہم چومیں، آنکھوں پہ رکھیں، سر پہ اٹھائیں، یہ محبت کا تقاضا ہے، ایمان کا تقاضا ہے، لیکن اگر کسی چیز کی صحیح سند ثابت نہ ہو۔ تو ہر ایرا غیرا کوئی بھی چیز اٹھا کے لے آئے۔ اور آ کے کہے کہ یہ حضور ﷺ کی ہے۔ تو اس کو متبرک سمجھ لینا اور اس کے ساتھ وہ برتاؤ شروع کر دینا یہ بھی ایک جہالت ہے۔

دین کا دارومدار سند ہے

ہمارے دین میں ہر بات سند کے ساتھ ہے کہ

''ہمیں کس نے کہا؟ اس کو کس نے کہا؟۔ اس کو کس نے کہا؟'' ہم اپنی ہر بات کی سند سرور کائنات ﷺ تک ثابت کرتے ہیں۔

وضوء ہم کرتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟۔ ہم نے اپنے استادوں کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے استادوں کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے استادوں کو دیکھا۔ حتیٰ کہ صحابی نے حضور ﷺ کو دیکھا۔ کہ آپ ایسے وضوء کرتے تھے۔ اس لیے وضوء کرنے کا یہ طریقہ سندِ صحیح کے ساتھ متصل چلا آرہا ہے۔

ہم نماز پڑھتے ہیں۔ ایسے کیوں پڑھتے ہیں؟۔ اس لیے کہ ہم نے اپنے استادوں کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے استادوں کو دیکھا۔ حتیٰ کہ سرور کائنات ﷺ کو دیکھنے والے بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ ایسے پڑھتے تھے۔ تو سندِ صحیح کے ساتھ ہمارے پاس وہ نماز موجود ہے۔

سندِ صحیح کے ساتھ اگر کوئی مسئلہ، کوئی بات ثابت ہو تو قابل قدر ہے۔ باقی کوئی آکے ایسے ہی کہہ دے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا یہ کوئی علمی بات نہیں ہے۔ یہ جہالت کی بات ہے۔

بے سند تبرکات اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ:

تو وہاں جو دہلی میں تبرکات تھے ان کی بھی کوئی سند نہیں تھی۔ لیکن ان کا سالانہ جلوس نکلتا تھا۔ اور بازار میں جہاں سے مجاور ان کو لے کے نکلتے تھے۔ وہ پیسے ڈالتے تھے۔ کھڑے ہو کے استقبال کرتے تھے۔ اور وہ جلوس اپنی جگہ سے چلتا تھا۔ شاہی قلعے میں جاتا تھا۔ بادشاہ اس کی زیارت کرتا تھا۔ زیارت کر کے انعامات سے نوازتا تھا۔

تو حضرت سید محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ جو بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ جن کو مولانا اسماعیل شہید کہتے ہیں۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے۔ جب انہوں نے توحید پہ وعظ کہنے شروع کیے۔ اور ردِّ بدعت کا سلسلہ شروع کیا، تو ایک دفعہ وہ وعظ کہہ رہے تھے۔ اتنے میں ادھر سے تبرکات کا جلوس آگیا۔ عادت کے مطابق لوگ اٹھنے لگے۔

تا کہ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کریں۔ تو آپ نے سختی سے منع کر دیا، کہ بیٹھے رہو۔ کوئی نہ اٹھ کے جائے۔ لوگ بیٹھے رہے۔

مجاوروں نے جب دیکھا کہ یہ تو مولوی اسماعیل نے لوگوں کو تبرکات کی تعظیم سے روکنا شروع کر دیا۔ اس طرح تو ہماری روزی بند ہو جائے گی۔ لوگ تعظیم نہیں کریں گے تو ہمیں فیس کہاں سے دیں گے۔ انہوں نے بنایا ہوا تو کاروبار ہوتا ہے۔

بادشاہ کے دربار میں جب جلوس گیا۔ تو ان مجاوروں نے جا کے بادشاہ کے پاس شکایت کی کہ یہ محمد اسماعیل لوگوں کو تبرکات کی تعظیم کرنے سے روکتا ہے۔ تو بادشاہ نے مولانا کو بلوا بھیجا۔ اور مولانا پہنچ گئے۔ کہتے ہیں کہ جب مولانا دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے لوگوں کی اور مجاوروں کی موجودگی میں مولانا سے سوال کیا۔ کہ آپ تبرکات کی تعظیم کیوں نہیں کرتے؟۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا جواب بعد میں دوں گا مجھے قرآن کریم کا اور بخاری شریف کا ایک نسخہ منگوا کے دو۔ تو اس نے حکم دیا۔ قرآن کریم کا نسخہ بھی مجلس میں آ گیا اور بخاری شریف کا نسخہ بھی مجلس میں آ گیا۔ جب مجلس میں آیا۔ تو مولانا نے اپنے ہاتھ میں ان کو پکڑا اور پکڑنے کے بعد واپس کر دیا۔ نہ اس کو کھولا۔ نہ اس کو پڑھا۔ بلکہ ویسے کا ویسے اس کو واپس کر دیا۔

اور بادشاہ کو مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ "آپ بتائیں! کہ کیا یہ اللہ کی کتاب ہے؟۔ وہ کہنے لگا۔ ہاں جی! اللہ کی کتاب ہے۔

پھر آپ نے پوچھا کہ آپ کو یقین ہے کہ اللہ کی کتاب ہے؟ کہنے لگا۔ جی ہاں! بالکل یقین ہے۔

پھر آپ نے پوچھا کہ کیا ایک ایک لفظ کے بارے میں یقین ہے کہ اللہ کا ہے؟ کہنے لگا ہاں جی۔

پھر آپ نے پوچھا کہ کیا آپ قسم کھا سکتے ہیں؟ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے؟۔ کہنے لگا۔ ہاں جی۔

آپ نے فرمایا بالکل صحیح۔ میں بھی حلف اٹھاتا ہوں۔ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اللہ کی جانب سے آیا ہوا ہے۔

اور پھر بخاری شریف کے متعلق پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ اللہ کے رسول کی کلام ہے؟ وہ کہنے لگا۔ ہاں مجھے یقین ہے۔ آپ نے پوچھا۔ قسم اٹھا سکتے ہو۔ کہنے لگا ہاں جی! قسم اٹھا سکتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول کی کلام ہے۔ آپ نے کہا کہ میں بھی قسم اٹھاتا ہوں ظنِ غالب کے طور پر کہ اس میں جتنی حدیثیں ہیں۔ ساری رسول اللہ ﷺ کی ہی ہیں۔

اچھا۔ بادشاہ صاحب! یہ جو تبرکات ہیں۔ آپ ان کے متعلق قسم اٹھا کے کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں۔ اب بادشاہ چپ۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کی کوئی دلیل تو نہیں۔ کوئی سند تو نہیں ہے۔ بس مشہور ہے کہ یہ حضور ﷺ کی ہیں۔ تو اس پر قسم کیسے اٹھائیں۔

فرمایا۔ کہ اگر تبرکات کا احترام کھڑا ہونے میں ہے۔ تو اللہ کی کلام جس کے متعلق تم قسم کھا کے کہتے ہو۔ کہ ویسے کا ویسے یہ محفوظ ہے۔ تو یہ قرآن تمہاری مجلس میں آیا۔ لیکن تم اٹھ کے کھڑے کیوں نہیں ہوئے؟۔ رسول اللہ ﷺ کی کلام تمہاری مجلس کے اندر آئی۔ جس کے متعلق تم قسم کھا کے کہہ سکتے ہو۔ کہ یہ اللہ کے رسول کی کلام ہے۔ تو تم اٹھ کے کھڑے کیوں نہیں ہوئے؟۔

- قرآن کا احترام تمہارے دل میں نہیں۔
- حدیث کا احترام تمہارے دل میں نہیں۔

جن کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سب تبرکات میں سے اتنا بڑا تبرک ہے کہ اس پر قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس کا تو احترام کرتے نہیں ہو۔ اور چند ایک ایسی چیزیں جن کے متعلق تمہیں پتہ ہی نہیں۔ کہ کہاں سے آئی ہیں؟ ان کے احترام میں اتنا بڑا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ کھڑے ہو ہو کے استقبال ہو رہا ہے۔ تو آخر یہ کیوں ہے؟۔

تو بادشاہ نے مجاوروں کو خطاب کر کے کہا، کہ اس مولوی سے الجھا نہ کرو۔ جس طرح سے یہ کرتا ہے۔ اس کو کرنے دو۔ الجھنے کے ساتھ معاملہ زیادہ خراب ہوگا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ کا اصل تبرک تو اللہ کی کتاب ہے۔ آپ ﷺ کا اصل تبرک تو آپ کی کلام ہے۔ جو حدیث کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کا ہمیں احترام اس وجہ سے بھی کرنا چاہیے کہ اللہ کی جانب سے آیا ہوا تبرک ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں ہیں۔ تو اس لحاظ سے یہ سب سے بڑا تبرک ہے۔

قرآن کی فضیلت:

اسی طرح سے حضور ﷺ فرماتے ہیں۔

((فَضلُ کَلَامِ اللّٰہِ عَلٰی سَائِرِ الکَلَامِ کَفَضلِ اللّٰہِ عَلٰی خَلقِہٖ))

''اللہ کے کلام کی فضیلت لوگوں کے کلاموں کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے اللہ کی فضیلت اللہ کی مخلوق کے مقابلے میں۔''

(سنن داری رقم ۳۳۱۹۔ الابانہ الکبری لا بن بطہ ۵/۷۹)

اب کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اس کا کوئی اندازہ ہے؟۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نصیب فرمادے۔ اور بالکل تر و تازہ ہے۔ جیسے چلی، ویسے موجود۔ اور اللہ تعالیٰ نے خوش قسمت لوگوں کو اس کے محفوظ رکھنے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ کہ سینہ بسینہ منتقل ہوتی ہوئی، آج ہمارے پاس ویسی کی ویسی موجود ہے۔

ہر چیز کی قیمت کیلئے مارکیٹ:

تو یہ امت کے بہت بڑے محسنین ہیں۔ اور اللہ کے بڑے برگزیدہ بندے ہیں۔ جو اللہ کی اس امانت کو اسی طرح سے آگے منتقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن آج ہمارے دل میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ ہم اس سے غافل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی اس کی قیمت معلوم ہونے کی مارکیٹ نہیں آئی۔

ہر چیز کی ایک مارکیٹ ہوتی ہے۔ جہاں اس کی قیمت کا پتہ چلتا ہے۔حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھانے کیلئے ایک واقعہ بیان کیا ہوا ہے۔ یا واقعتاً کوئی بات ہے۔ اس بارے میں میں کچھ نہیں کہتا۔ بہر حال مثال بہت عمدہ دی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک نوجوان تھا۔ وہ کسی شاعر کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگ گیا۔تو شاعروں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کوئی شعر یا کوئی نظم یا غزل کہتے ہیں۔ کہ

- یہ ۱۰۰۰روپے کی ہے۔
- یہ ۵۰۰۰روپے کی ہے۔
- یہ دس ہزار روپے کی ہے۔
- یہ بیس ہزار روپے کی ہے۔

تو وہ شاعر بھی شعر کہتا۔ اور اپنے شاگرد کو کاپی پہ لکھا دیتا۔ اور کہتا کہ یہ شعر ۱۰۰۰روپے کا ہے۔اور کوئی نظم کاپی پہ لکھوا دیتا اور کہتا کہ یہ نظم ۱۰۰۰روپے کی ہے۔تو شاگرد بڑا خوش ہوتا۔ کہ میرے پاس بہت دولت جمع ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک دن اس کے والدین نے کہا کہ تو اپنی عمر ضائع کر رہا ہے۔ نہ کچھ کماتا ہے۔ نہ ہمیں لا کے دیتا ہے۔ نہ خود تیرے خرچ کرنے کے لیے تیرے پاس کچھ ہے۔ تیری عمر بڑی ہوتی جا رہی ہے۔تو تو کوئی کام کیا کر۔ وہ کہنے لگا۔ اماں! تجھے تو پتہ نہیں۔ میں تو بہت بڑا دولت مند ہو گیا ہوں۔ میرے پاس تو ہزاروں روپے کے شعر ہیں، کئی کئی ہزار روپے کی نظمیں ہیں۔تو میں تو بہت دولت مند ہو گیا ہوں۔

تو اس کی ماں کہنے لگی۔ کہ مجھے ہزاروں کی تو ضرورت نہیں ہے۔آج پکانے کیلئے بازار سے سبزی لا کے دے۔ وہ جاتا ہے۔ اور ایک سبزی کی دکان والے کو جا کے کہتا ہے۔ کہ بھائی! آدھا کلو آلو دے دے۔ میں آپ کو ۱۰۰۰روپے کا شعر سناؤں گا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ بھائی! آدھا کلو آلو لینے ہیں۔تو چار آنے لے کے آ۔ پیسے لے آ۔شعروں کے عوض میں آلو نہیں ملتے۔ کہاں بھولے پھر رہے ہو؟۔

وہ سمجھا کہ یہ دکان والا شاید جاہل ہے اس کو پتہ نہیں۔ چنانچہ وہ دوسری دکان پہ چلا گیا۔ جا کے اس کو کہتا ہے کہ بھائی! مجھے آدھا کلو آلو دے دے۔ میں تجھے ایک ہزار روپے کا شعر سناؤں گا۔ اس نے بھی دھتکار دیا۔ وہ تیسری دکان پہ گیا۔ وہاں جا کے اس نے ایسی بات کی۔ تو اس نے بھی دھتکار دیا۔ چنانچہ بے چارہ دھکے کھاتا ہوا واپس آگیا۔ کسی نے آلو نہیں دیے۔ تو سیدھا اپنے استاذ کے پاس آگیا۔ اور کاپی اٹھا کے اس کے قدموں میں ماری۔ کہ مجھے آپ نے اتنا دھوکہ دیا کہ یہ ہزار، ہزار روپے کا شعر ہے؟۔ سبزی فروش تو اس کا آدھا کلو آلو بھی نہیں دیتا۔ تو شاعر پوچھتا ہے۔ تو کہاں گیا تھا؟۔ وہ کہتا ہے۔ میں سبزی منڈی گیا تھا۔

شاعر نے کہا۔ یہ سبزی منڈی میں بیچنے کی چیز نہیں ہے۔ کل کو بادشاہ کے دربار میں مشاعرہ ہوگا۔ تو وہاں جانا۔ اور میری فلانی نظم پڑھنا۔ جس کے بارے میں میں نے تجھے کہا تھا کہ یہ ۵۰۰۰ روپے کی ہے۔ پھر تجھے [illegible] گا۔ چنانچہ بادشاہ کے دربار میں مشاعرہ ہوا۔ تو اس نے بھی جا کے نظم پڑھی۔ تو واقعۃً اس کو ۵۰۰۰ روپے انعام مل گیا۔

تب استاد نے کہا۔ کہ ہر چیز کی ایک مارکیٹ ہوتی ہے۔ بازار میں

- آلو، مٹر کی قیمت تو ہے۔
- مولی، گاجر کی قیمت تو ہے۔
- ٹماٹر، پیاز کی قیمت تو ہے۔
- گوبھی، شلجم کی قیمت تو ہے۔
- کدو، کریلے کی قیمت تو ہے۔
- بھنڈی، توری کی قیمت تو ہے۔
- شعر کی قیمت نہیں ہے۔

شعر کی قیمت معلوم اس وقت ہوئی۔ جب بادشاہ کے دربار میں مشاعرہ ہوا۔ اس

لیے کسی بھی چیز کی قیمت اگر معلوم کرنی ہو تو اس کی مارکیٹ سے معلوم کرو۔

قرآن کی قیمت کیلئے مارکیٹ:

یہ دولت جوان بچوں کے پاس جمع کی جارہی ہے۔ ہم ان کو دھوکہ نہیں دے رہے۔ کہ تمہیں بہت بڑی دولت مل گئی۔ اور یہ کہیں کہ جی! باہر ہم جائیں تو ہمیں تو قرآن کریم کے حافظ ہونے کے حوالے سے

- کوئی چپڑاسی رکھنے کیلئے تیار نہیں۔
- کوئی چوکیدار رکھنے کیلئے تیار نہیں۔
- کوئی ملازم رکھنے کیلئے تیار نہیں۔
- کوئی نوکر رکھنے کیلئے تیار نہیں۔
- کوئی منشی رکھنے کیلئے تیار نہیں۔

تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت بڑی دولت ہے؟۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ بیٹے! اس کی قیمت معلوم کرنے کیلئے یہ مارکیٹ نہیں ہے۔ تم اس مارکیٹ کے ہو جو اللہ کی دربار میں لگے گی۔ اور اس کی قیمت کا پتہ مرنے کے بعد چلے گا۔ جب آپ اس زمین سے چند گز نیچے چلے جائیں گے۔ وہاں سے اس کی مارکیٹ کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور وہاں جاکے اس کی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ اس دنیا نے تو افضل الخلق، اللہ کی مخلوق میں سے سب سے افضل، جس سے آگے افضلیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا، محمد رسول اللہ ﷺ۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس افضل الخلق کو بھیجا تھا۔ اور اس کے اوپر یتیمی کا پردہ ڈال دیا تھا۔ تو کوئی دائی اٹھا کے سینے سے لگانے کیلئے تیار نہیں تھی۔ ساری دائیاں یہ سن کر کہ یتیم ہے۔ واپس چلی گئیں۔

- کوئی اٹھانے کیلئے تیار نہیں تھا۔
- کوئی گود میں لینے کیلئے تیار نہیں تھا۔
- کوئی سینے سے لگانے کیلئے تیار نہیں تھا۔

- کوئی کندھے پہ بٹھانے کیلئے تیار نہیں تھا۔
- کوئی پالنے کیلئے تیار نہیں تھا۔
- کوئی پرورش کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔
- کوئی تربیت کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔

تو اب اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے بے قدر کر دیا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی۔ اللہ کے رسول پر یتیمی کا پردہ ڈال کر اس کو بے قیمت نہیں کیا گیا۔ بلکہ بے قدروں کے ہاتھوں سے بچایا ہے۔ جنہوں نے اس یتیم کی قدر کی۔ اللہ نے ان کو جو شان دی ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے، اور جنہوں نے بے قدر سمجھ کے چھوڑ دیا تھا۔ آج ان کا نام ونشان معلوم نہیں۔ اور جس نے اس یتیم کی قدر کی۔ آج

- کتنا محبت والفت کے ساتھ۔
- کتنا عزت واحترام کے ساتھ۔
- کتنا عقیدت وعظمت کے ساتھ۔

لوگ ان کے گن گاتے ہیں۔ اور کس طرح سے ان کا نام محبت اور پیار کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

اللہ کی عظیم حکمت:

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بہت بڑی عظیم نعمت کو اگر یہاں کچھ مسکنت کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ تو اس کو بے قدر کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ

- جن کے دل میں دنیا کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں ڈالروں کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں سونے کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں چاندی کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں دولت کی محبت ہے۔

- جن کے دل میں اقتدار کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں مال وزر کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں جائیداد کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں کوٹھیوں کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں محلات کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں بنگلوں کی محبت ہے۔
- جن کے دل میں عیش وعشرت کی محبت ہے۔

ان سے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کو بچا کے مساکین کے حصے میں رکھا ہے۔ تاکہ مساکین اس نعمت سے مالا مال ہوں اور دنیا وآخرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی تو دنیا بھی خوشحال ہوتی ہے۔ ان کی آخرت بھی خوشحال ہوتی ہے۔ تو یہ ایک بہت [illegible] ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نصیب فرمادیں۔

وہ ماں باپ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جن کے بچوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ دولت نصیب فرمائی۔ اور اساتذہ تو سب کے محسن ہیں۔ جو اس دولت کو آگے منتقل کرتے ہیں۔ تو سارے کے سارے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا شکریہ اداء کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت عطاء فرمائے

یہ فاروقی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے کا جو ختم ہوا ہے۔ بس اس خوشی میں حاضر ہو گیا ہوں۔ ورنہ تو اتنے لمبے سفر کی ہمت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اس کی برکات نصیب فرمائے۔

cer Demo

ہم مدینے کیوں جاتے ہیں؟

بمقام: مدینہ منورہ (روضۂ رسول ﷺ کے قریب)

دسمبر ۲۰۰۷ء

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِيْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَہٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِيْكَ لَہٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذَا جَاءَ كَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءً ا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (پ ۷۔ سورہ انعام۔ آیت ۵۴)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ وَبَلَّغَنَا رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔

○○○○○

تمہید

ہمارے مدارس میں ایک طریقہ جاری ہے، ایک رواج چلا آرہا ہے کہ درس گاہ میں استاد ایک مسئلے کے اوپر تقریر کرتا ہے، طلبہ اس کو سنتے ہیں، سننے کے بعد آپس میں اس کو دہراتے ہیں۔ جس سے مقصد ہوتا ہے کہ استاد سے سنی ہوئی بات اچھی طرح سے یاد ہو جائے۔ اس طریقہ کار کو ہمارے ہاں تکرار کہتے ہیں۔ یہ تکرار ہماری تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔

بعینہ اسی طرح روضہ اقدس، مسجد نبویؐ میں حاضری کے آداب اور فضائل، یہ آپ اور میں علماء کی زبان سے ہمیشہ سنتے رہتے ہیں تو میرا آج کا بیان ان سنی ہوئی باتوں کا تکرار ہے۔ اس لیے آپ اس جستجو میں نہ رہیں کہ میں کونسی نئی بات کہوں گا؟ نئی بات کوئی نہیں ہوگی۔

- ☆ اپنے اکابر سے۔
- ☆ اپنے اسلاف سے۔
- ☆ اپنے بزرگوں سے۔
- ☆ اپنے اساتذہ سے

جو سنا۔ اور جو اللہ نے ذہن میں محفوظ رکھنے کی توفیق دی۔ اسی کا اظہار ہوگا۔ تاکہ سبق اچھی طرح پختہ ہو جائے۔

مدینہ میں حاضری کی شرعی حیثیت

اللہ کی توفیق سے ہم سارے مدینہ منورہ آئے ہوئے ہیں۔ یاد رکھئے! مدینہ منورہ کی حاضری حج کا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بغیر بھی حج کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جن دنوں میں یہاں راستے محفوظ نہیں تھے۔ یہ سعودیوں کی حکومت سے پہلے۔ ترکیوں کے زمانے میں جب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ تو بہت سارے قافلے مکے سے

مدینہ آتے ہوئے راستے میں لٹ جاتے تھے۔ اس لیے اس خوف کے مارے بہت سارے حاجی مدینہ آتے ہی نہیں تھے۔ بلکہ کے آتے تھے اور حج کر کے واپس چلے جا تے تھے تو ان کا حج ادا ہو جاتا تھا۔

مسجد نبوی اور مسجد حرام کی نمازوں کی فضیلت

شرعی طور پر جو حج فرض ہے مدینے کی حاضری اس کا حصہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر ہم مدینے کیوں آتے ہیں؟ ہمارا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟ کوئی ثواب حاصل کرنے آتے ہیں؟ کیونکہ ثواب بھی تو کے میں زیادہ ہے۔

آپ روز سنتے ہوں گے کہ حرم شریف میں ایک نماز ایک لاکھ نماز کے برابر ہے اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ میں جو نماز پڑھی جاتی ہے، ایک روایت اس کے متعلق ہے لیکن وہ کمزور درجے کی ہے۔ مشکوۃ شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ (مشکوۃ ص 72۔ ابن ماجہ ص 102)

لیکن جو صحیح اور متفق علیہ روایت ہے۔ جو بخاری میں موجود ...... مسلم میں موجود ...... اور اس وقت مسجد نبوی ﷺ میں جو ترکوں والا حصہ ہے اس کی پیشانی کے اوپر لکھی ہوئی ہے۔ یہی روایت جس کو میں کہہ رہا ہوں صحیح ... پلی ... سکی .... روایت۔

آج آپ جب مسجد میں جائیں کے تو پھتریوں والے حصے میں کھڑے ہو کر دیکھیں گے تو جہاں سے ترکوں کی مسجد شروع ہوتی ہے وہاں اوپر ایک تختی لگی ہوئی ہے اور اس کے اوپر یہ حدیث لکھی ہوئی ہے۔

صَلٰوةٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ صَلٰوةٍ فِیْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

کہ میری اس مسجد میں نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں نماز پڑھنے سے ایک ہزار

درجہ بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے۔ یعنی مسجد حرام کے ساتھ تقابل نہیں ہے۔

(بخاری۔ 159/1۔ مسلم 446/2۔ مشکوۃ 67/1)

باقی پچاس ہزار نمازوں کے برابر والی روایت بھی فضائل میں ہے۔ لیکن صحت کے اعتبار سے پہلی حدیث کے برابر نہیں ہے۔ اب آپ چاہے پچاس ہزار والی روایت لیں، چاہے ہزار والی روایت لیں۔

اللہ کی عبادت میں تاجرانہ ذہن

یہ عام محاورے کے مطابق بات کر رہا ہوں۔ ورنہ میں حساب کتاب کا قائل نہیں ہوں۔ اللہ کے ساتھ معاملہ تاجرانہ ذہن کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے۔

تو عبادت چوں گدایاں بشرطِ مزد مکن
کہ خواجہ خود انداز بندہ پروری داند

مزدوری کی شرطیں لگا کے بندگی نہ کرو۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے بندوں پہ مہربانی کیسے کرنی ہے۔ اس کے ساتھ شرطیں نہ لگاؤ۔ اسی کا ترجمہ علامہ اقبال نے بھی ایک شعر میں کیا ہوا ہے۔

یہ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بوالہوس! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

یعنی یہ کوئی اللہ کے ساتھ تجارت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی عبادت ہے۔ تو شرطیں لگا کر کہ

- ☆ میں یوں کروں گا تو 70 لوں گا۔
- ☆ میں یوں کروں گا تو 700 لوں گا۔
- ☆ میں یوں کروں گا تو 1000 لوں گا۔
- ☆ میں یوں کروں گا تو 100000 لوں گا۔
- ☆ میں یوں کروں گا تو ایک کروڑ لوں گا۔

یہ سوداگری نہیں ہے۔ یہ خدا کی عبادت ہے۔

ہماری نمازوں کا حال

یہاں تو رو کر یہ کہو کہ اے اللہ! جیسی کیسی ٹوٹی پھوٹی ہے۔ قبول کرلے۔ کیوں؟ یہ بات یاد رکھیے! اضافہ تب ہوا کرتا ہے کہ جس وقت اصل باقی ہو اور صحیح ہو اور اگر اصل باقی اور صحیح نہیں ہے تو اضافے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تمہیں کس طرح سے اطمینان ہے کہ جو تم نماز پڑھ رہے ہو یہ صحیح ہے؟

☆ کیا تمہیں اپنے کپڑوں کے پاک ہونے کا اعتماد ہے؟
☆ کیا تمہیں اپنے کپڑوں کے حلال آمدنی سے ہونے کا اعتماد ہے؟
☆ کیا تم صرف نماز کی صورت بناتے ہو یا نماز کی حقیقت بھی موجود ہے؟

ہماری نمازوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ کھڑے ہوگئے، قبلہ کی طرف منہ کرلیا، ہاتھ باندھ لیے، لیکن دل و دماغ پتہ نہیں کہاں پہنچا ہوا ہے؟ تو اگرچہ دیکھنے والا تمہیں نمازی سمجھے گا۔ لیکن جو " عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر "ہے اس کے سامنے تو حقیقت ہے کہ تم بازار میں پھر رہے ہو یا مسجد میں ہو؟ یہ تو ظاہری حال ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ

☆ آپ قیام میں کھڑے ہوئے ہیں۔
☆ آپ نے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔
☆ آپ قرأت کررہے ہیں۔
☆ آپ سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔
☆ آپ رکوع میں جھکے ہوئے ہیں۔
☆ آپ تسبیحات پڑھ رہے ہیں۔
☆ آپ تشہد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس لیے فقہاء کہہ دیتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھ لی۔ لیکن جس کی صرف ہماری

صورتوں پر نظر نہیں بلکہ حقیقت پر بھی نظر ہے۔ اس کے تو سامنے ہے۔ کہ جب ہم نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو کہاں پھر رہے ہوتے ہیں۔

☆ مسجد میں ہوتے ہیں یا گھر میں ہوتے ہیں؟

☆ مسجد میں ہوتے ہیں یا دکان میں ہوتے ہیں؟

☆ مسجد میں ہوتے ہیں یا بازار میں ہوتے ہیں؟

☆ مسجد میں ہوتے ہیں یا سیر کر رہے ہوتے ہیں؟

☆ مسجد میں ہوتے ہیں یا دوستوں کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں؟

☆ مسجد میں ہوتے ہیں یا تجارت کر رہے ہوتے ہیں؟

وہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اگر یہی نماز جس پر ہم اعتماد کیے بیٹھے ہیں۔ اس پر اعتماد کر کے ہم کہیں کہ اللہ سے ہم تو اس کے بدلے 1000 لیں گے، ہم تو اس کے بدلے لاکھ لیں گے۔ اب اگر یہی اصل نماز بھی اٹھا کر منہ پر ماردی گئی تو تمہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

کیلکولیٹر بھی شمار کرنے سے عاجز

اس لیے یہاں تو یہی ہے کہ جیسی ٹوٹی پھوٹی ہے، قبول کر لے!

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ . فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا

جو کچھ ہم لے کے آئیں ہیں یہ تو دھتکارنے کے قابل ہے۔ لیکن تو قبول کر لے! اور اگر اللہ قبول کر لے گا تو پھر وہ حساب لاکھوں پر نہیں آتا پھر کروڑوں پر پہنچتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر اللہ کے راستے میں کوئی ایک کھجور صدقہ کرے اور اللہ اس کو قبول کر لے۔ تو اللہ اس کو اس طرح سے بڑھاتے ہیں جس طرح سے تم گھر میں پیدا ہونیوالے گھوڑے کے بچے کو پالتے ہو اور بڑھاتے ہو۔

كَمَا يُرَبِّيْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ

پھر بڑھاتے ... بڑھاتے . بڑھاتے اس کو احد پہاڑ کے برابر کر

دیتے ہیں۔ یہ بات صحیح حدیث میں ہے۔

(مشکوۃ۔ 167/1۔ بخاری 189/1۔ مسلم 326/1)

اب آپ کیلکیولیٹر لے لو۔ اگر تو وزن کے اعتبار سے احد پہاڑ کے ٹکڑے کرو (یہ احد پہاڑ چھ میل لمبا ہے اور مدینہ منورہ کے سارے پہاڑوں میں سب سے زیادہ اونچا ہے) اگر احد پہاڑ کے کھجور کے برابر حجم کے اعتبار سے ٹکڑے بنائیں تو کیا خیال ہے ایک لاکھ بنے گا؟

آپ کے کیلکیولیٹر کا عدد ختم ہو جائے گا لیکن وہ تعداد پوری نہیں ہوگی اور اگر وزن کا اعتبار کرلیا جائے تو تعداد اور بھی بڑھ جائے گی۔ کیونکہ حجم میں کھجور کے برابر پتھر لیں تو وزن میں اس کے برابر تین چار کھجوریں آجائیں گی۔ تو اس طرح حساب اور بھی بڑھ جائے گا۔ اس لیے کیا ضرورت ہے کہ ہم اس جواد کریم کے ساتھ حساب کرنے کیلئے بیٹھیں۔ بس ہماری درخواست یہ ہونی چاہیے کہ قبول کرلے! اگر قبول ہوگئی تو سب کچھ ہے۔ ورنہ سارے حساب یہیں رکھے رہ جائیں گے۔

مدینہ میں ثواب کم ہونے کے باوجود ہم کیوں آتے ہیں؟

تو میں کہہ رہا تھا کہ ثواب تو مدینہ کے مقابلے میں مکہ کے اندر زیادہ ہے۔ تو پھر یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ حج یہاں نہیں ہوتا، ثواب یہاں مسجد حرام سے زیادہ نہیں ملتا۔ اگر تاجرانہ ذہن لے کر حساب لگانے بیٹھیں تو آدمی یہ سوچتا ہے کہ یہ تو خسارے کا سودا ہے۔

یہ واقعہ ہے جو میں آپ کی خدمت میں عرض کرنے لگا ہوں کہ اللہ کی توفیق کے ساتھ تقریباً 1403 ھ میں، یہ آج سے 25 سال پہلے کی بات ہے۔ میں رمضان المبارک میں حاضر ہوا تھا۔ تقریباً پونے دو مہینے مدینہ منورہ میں رہا۔ دوست، احباب یہاں آئے۔ حج کے دنوں میں واپس مکہ معظمہ چلے گئے۔ اور تقریباً ڈیڑھ مہینہ مکہ میں رہنے کا موقع ملا۔ تو حج کے بعد روانگی میں تین چار دن باقی تھے اس لیے میں اور

میرے دو دوست آپس میں بیٹھ کر مشورہ کر رہے تھے کہ اگر موقع ملے تو ایک دن کیلئے مدینہ ہو آئیں۔

ہمارے پاس ایک مظفر گڑھ کا ساتھی بیٹھا تھا۔اس کی ملتان غلہ منڈی میں دکان ہے۔وہ کہنے لگا'' مولوی صاحب!ایک بات تو بتاؤ کہ ادھر تو کہتے ہو یہاں (مکہ میں) ایک کے لاکھ ہیں اور مدینہ میں ایک کے پچاس ہزار ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ پچاس ہزار بھی نہیں۔ بلکہ ایک ہزار۔ کہنے لگا کہ پھر بھاگ بھاگ کے مدینے کیوں جاتے ہو؟۔

میں نے کہا کہ شیخ صاحب! آپ ہیں تاجر۔حساب تو آپ جانیں ہم تو کہتے ہیں کہ

''یہ ہر جگہ ملتا ہے۔وہ وہیں ملتا ہے''

بات سمجھ گئے؟ یعنی یہاں والا تو ہر جگہ ملتا ہے لیکن وہاں والا صرف وہیں ملتا ہے۔ ہم تو اس کو ملنے کیلئے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم بھاگ بھاگ کے مدینہ جاتے ہیں۔

محبوب ﷺ کی طرف سے سلام اور بشارتیں

کیوں نہ بھاگ بھاگ کر جائیں؟ ان کی وجہ سے سب کچھ ملا۔ یہ بشارت جو قطعی طور پر قرآن نے ہمارے سامنے ذکر کی ہے کہ جب ایمان والے آئیں تو انہیں کہو ''السلام علیکم''

آپ یہ تصور کریں کہ رسول اللہ ﷺ کہ مقبرے پہ آپ کی حاضری ہو۔ایک تو آپ سلام کہتے ہیں اور ایک اللہ فرمارہے ہیں کہ انھیں کہو'' السلام علیکم'' اور ساتھ یہ بشارت سناؤ کہ اللہ نے رحم کرنا اپنے اوپر لازم کرلیا ہے اور اللہ کا بہت بڑا رحم یہ ہے کہ اگر کسی سے غلطی ہوگئی ہے تو کہہ دو۔ ''اللہ! معاف کردے'' تو میری طرف سے ان کو بشارت دے دو۔

فَاِنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْم

ہر چیز کیلئے ایک حس ہوتی ہے

ہم اپنے کان سے یہ بشارت اگرچہ نہیں سنتے لیکن جن کو اللہ نے توفیق دی ہے

☆ وہ سلام بھی سنتے ہیں۔

☆ جواب بھی سنتے ہیں۔

☆ بشارتیں بھی سنتے ہیں۔

سمجھانے کیلئے آپ کی خدمت میں بات عرض کر دوں۔

اللہ نے جہان مختلف بنائے ہیں۔ لیکن ہر جہان کے احساس کیلئے اللہ نے ایک حس رکھی ہے۔ ایک رنگ کا جہان ہے جیسے آپ کے ہاں رنگ برنگے پھول ہیں، رنگ برنگے باغات ہیں۔ اس جہان کو معلوم کرنے کا ذریعہ آنکھ ہے۔ اگر کوئی آنکھ سے محروم ہے، آپ اس کو کہیں کہ گلاب کا یہ رنگ ہے، چنبیلی کا یہ رنگ ہے، کتنے شاندار پھول ہیں۔ وہ کہے گا پتہ نہیں کیا بک بک کر رہے ہو؟ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ کہاں ہے رنگ؟ جھوٹ بولتے ہو؟ تو کیا آپ اسے سمجھا لیں گے؟ اسے چنبیلی اور گلاب کے پھول کا فرق بتا لیں گے؟ اگر اس کی آنکھ نہیں ہے تو۔

ایک خوش آوازی کا جہان ہے۔ جتنی قسم کی آوازیں، ترنم، خوش آوازیاں، جن کا شمار نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر کوئی شخص شنوائی سے محروم ہے، بہرہ ہے۔ اس کیلئے بھی یہ جہان اجنبی ہے۔ کیا آپ اس کو سمجھا سکتے ہیں کہ ترنم کیا ہوتا ہے؟ قاری صاحب نے کتنی خوش آوازی کے ساتھ نعت پڑھی تھی۔ کیا کسی بہرے کو بتا لو گے؟ آپ ہزار بار قسمیں کھائیں۔ وہ کہے گا کہ جھوٹ بولتے ہو۔ کچھ بھی نہیں۔ کیا ہوتا ہے ترنم؟

مزے کا ایک جہان ہے

☆ آم کا اور مزہ ہے .... کھجور کا اور مزہ ہے۔

☆ سیب کا اور مزہ ہے .... انگور کا اور مزہ ہے۔

☆ مالٹے کا اور مزہ ہے .... امرود کا اور مزہ ہے۔

☆ بادام کا اور مزہ ہے .... اخروٹ کا اور مزہ ہے۔

اللہ نے کتنی لذتیں آپ کیلئے جمع کر رکھی ہیں۔ لیکن اگر کسی کی زبان کا ذائقہ بے حس ہو جائے۔ تو کیا وہ ان ذائقوں میں فرق کر سکے گا؟ وہ تو کہے گا کہ ہر چیز ہی کڑوی ہے۔ جیسے صفراوی مزاج کا آدمی (جس کو صفرا کا بخار ہو جائے) اگر اس کو جلیبی کھلائی جائے تو وہ کہے گا کہ کڑوی ہے۔ تو اگر مزاج بگڑا ہوا ہو تو ان ذائقوں کا کہاں پتہ چلتا ہے۔

روحانیت کا جہان

اسی طرح سے میرے دوستو! میرے بزرگو! ایک روحانیت کا جہان بھی ہے۔ اس روحانیت کے ساتھ قبر کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس روحانیت کے ساتھ یہاں رہتے ہوئے ملائکہ (فرشتوں) کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس روحانیت کے ساتھ اس ساری فضاء کے اندر، گھاس کے ایک ایک پتے میں اللہ کی قدرت نظر آتی ہے۔ پھر انسان دیکھ کے چیخ اٹھتا ہے کہ

ہر گیہے کہ از زمیں مے روید
وحدہ لا شریک لہ مے گوید

کہ گھاس کا ایک تنکا بھی اگر زمین سے اگتا ہے تو یہ پکارتا ہوا اٹھتا ہے وحدہ لا شریک لہ............ وحدہ لا شریک لہ............ پھر یہ سب باتیں انسان کو معلوم ہوتی ہیں۔

فضاء میں دنیا کی ساری زبانیں موجود ہیں

بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہاں جو ہم بیٹھے ہیں۔ پوری دنیا کی آوازیں اور زبانیں اس جگہ موجود ہیں

☆ انگریزی یہاں موجود .... فارسی یہاں موجو۔

☆ عربی یہاں موجود .... پشتو یہاں موجو۔

☆ اردو یہاں موجود .... پنجابی یہاں موجود۔

☆ ہندی یہاں موجود .... چینی یہاں موجود۔

☆ سندھی یہاں موجود .... بلوچی یہاں موجود۔

☆ میواتی یہاں موجود .... سرائیکی یہاں موجود۔

یہ فضاء ساری کی ساری آوازوں سے بھری ہوئی ہے۔لیکن جس کو یہ ذریعہ میسر ہے۔کہ

☆ یوں کر کے بٹن دبا کے سنا تو عربی سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو انگریزی سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو فارسی سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو پنجابی سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو سرائیکی سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو اردو سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو پشتو سنی جارہی ہے۔

☆ ایک اور بٹن دبا کے سنا تو سندھی سنی جارہی ہے۔

تو یہاں ہے تو آپ سنتے ہیں۔وہ آواز یہاں آئی تو آپ کے کان میں پہنچ رہی ہے نا؟ کیونکہ آپ کے پاس ایک ذریعہ ہے۔اور مثلاً میرے پاس ذریعہ نہیں۔تو میں کہوں گا کہ ساری فضاء خالی ہے۔کچھ بھی نہیں۔اب یہاں مختلف زبانوں والے مختلف ملکوں کے مختلف علاقوں کے لوگ بیٹھے ہیں۔اور ہر کسی کے ہاتھ میں موبائل ہے۔

☆ کوئی یہیں بیٹھا عربی میں باتیں سن رہا ہے۔

☆ کوئی یہیں بیٹھا انگریزی میں باتیں سن رہا ہے۔

☆ کوئی یہیں بیٹھا فرانسیسی میں باتیں سن رہا ہے۔

☆ کوئی یہیں بیٹھا اردو میں باتیں سن رہا ہے۔

تو یہ آوازیں یہاں موجود ہیں تو آپ سن رہے ہیں نا؟ اور ساری آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن جس کے پاس ذریعہ نہیں ہے۔ وہ کیا کرے؟

بے حس کو چاہئے کہ حس والے پر اعتماد کرے

اس کو چاہئے کہ جس کو یہ ذریعہ میسر ہے، اس پہ اعتماد کرے۔ اب اندھا کہے کہ مجھے چاند نظر نہیں آتا۔ اس لیے مجھ پر روزہ ہی فرض نہیں ہے۔ کیونکہ روزہ چاند دیکھنے کے بعد فرض ہوتا ہے۔ اور مجھے چاند نظر آ نہیں رہا۔ اس لیے مجھ پر روزہ ہی فرض نہیں۔ تو آپ اس کو کیا کہیں گے؟ آپ کہیں گے کہ بھائی! اندھے کا کام ہے کہ آنکھوں والے پہ اعتماد کرے۔ یقین کرنے کا ذریعہ صرف آنکھ سے دیکھنا ہی نہیں۔ اور بھی ذرائع ہیں جن کے ساتھ انسان ایک چیز کو معلوم کر لیتا ہے۔ بس یہاں آ کے ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ خود آنکھیں ہوتی نہیں اور آنکھوں والوں پہ اعتماد نہیں کرتے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو روضہ اقدس سے سلام کا جواب

اب اگر تمہیں میں کہوں کہ ہمارے بزرگوں میں سے ایک بزرگ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں۔ ان کا واقعہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ اور مستند طریقے سے لکھا ہوا ہے کہ جب حضرت مدینہ تشریف لائے اور روضہ اقدس پر حاضر ہوئے اور آ کے کہا کہ

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَالِدِی!

چونکہ سید تھے اس لیے کہا کہ ابا! السلام علیکم۔

تو جواب آیا

وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ يَا ابْنِی!

بیٹے! وعلیکم والسلام!

اور اتنی آواز آئی کہ پاس والوں نے بھی سن لی۔ اب آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اتنی اوپر مٹی ہے۔ اتنی موٹی موٹی دیواریں ہیں تو کیسے آواز آ گئی؟ تو ہم تو صرف یہ کہہ

سکتے ہیں کہ آواز آ گئی۔ باقی کیسے آ گئی؟ یہ کسی آنکھ والے سے پوچھو؟ اس کو پتہ ہو گا کہ کیسے آ گئی۔ وہ کہے گا کہ درمیان میں کوئی چیز حائل ہے ہی نہیں۔ اگر آپ نہ مانیں تو پھر وہی بات آ جائے گی کہ خود بھی اندھا ہے اور آنکھوں والے کی بات بھی نہیں مانتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سینکڑوں میل دور پہنچ گئی

اب اگر ہم کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہیں اور لڑائی ہو رہی ہے ایران کے علاقے میں، فارس کے علاقے میں۔ اس فوج کا سپہ سالار ساریہ ہے، جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچانک بلند آواز سے بولتے ہیں

يَا سَارِيَةُ الْجَبَلَ

اے ساریہ! پہاڑ کی طرف دیکھو

اب سننے والے بھی حیران بیٹھے ہیں کہ کیا ہو گیا؟ اور خطبے میں یہ کیسا جملہ آ گیا؟ لیکن ہزار، دو ہزار میل کے فاصلے پہ میدان جنگ ہے اور اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دکھا دیا۔ اور یہاں کھڑے ہدایات دے رہے ہیں۔ اور یہاں سے آواز بھی جا رہی ہے۔ اور ساریہ سن بھی رہے ہیں۔ (مشکوۃ 546/1 وقال الالبانی حسن)

آج اگر میں یہ کہوں۔ تو آپ فوراً مان جائیں گے کہ ہاں آج کل سلسلہ ایسا ہے۔ کہ کمانڈر اسلام آباد بیٹھا ہے۔ اور ہدایات کراچی دے رہا ہے۔ اور ایک مردود امریکہ بیٹھا ہے اور اس کی ہدایات پاکستان میں سنی جا رہی ہیں۔ اور وہاں دیکھی جا رہی ہیں۔ آج ہم مان جائیں گے۔ کیوں؟ کہ آپ کے سامنے ایک بنی ہوئی چیز آ گئی جس پر آپ نے اتنا اعتماد کر لیا کہ یہ صحیح دکھاتی ہے۔ صحیح سناتی ہے۔

لیکن جو روحانیت کا سلسلہ ہے۔ وہ چونکہ نہ آپ کو حاصل، نہ مجھے حاصل۔ اس لیے نہ دیکھا جا سکتا ہے، نہ سنا جا سکتا ہے۔

بیت المقدس منکشف ہو گیا

رسول اللہ ﷺ معراج پہ تشریف لے گئے۔ اب کوئی کہے کہ کیسے چلے گئے؟ اتنی

تیز رفتار تو کوئی سواری ہوتی نہیں۔ چنانچہ جب واپس آئے تو سارے مشرک ہنس رہے ہیں۔کہ لو جی! یہ کہتا ہے کہ میں رات بیت المقدس گیا تھا۔ اور وہاں سے ہو کے آیا ہوں۔تو انہوں نے ایک تماشہ بنا لیا۔کہ کیسے چلے گئے؟ حالانکہ ایک مہینہ آنے پہ لگتا ہے۔ایک مہینہ جانے پہ لگتا ہے۔اور یہ ایک رات میں ہو کے آ گئے؟

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ سارے مشرکین میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔اور اکٹھے ہو کے (چونکہ یہ تجارت کیلئے اس طرف جاتے رہتے تھے) مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا۔کہ اچھا! اگر گئے تھے۔تو بتاؤ کہ فلانی چیز کیسی ہے؟ اب آپ اپنی مسجد میں زندگی بھر نمازیں پڑھتے ہیں۔لیکن آپ سے کوئی پوچھ لے کہ بتاؤ وضو والی جگہ پر ٹوٹیاں کتنی ہیں؟ تو آپ نہیں بتا سکتے؟ مسجد کے دروازے اور کھڑکیاں کتنی ہیں۔؟ تو آپ گنتے پھرتے ہیں؟ کیا کوئی آدمی مسجد میں ایسی چیزیں شمار کرتا ہے؟ تو انہوں نے بھی ایسے باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔

اب رسول اللہ ﷺ کے الفاظ حدیث میں یہ ہیں کہ مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ اتنا صدمہ زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔کہ میں کیسے بتاؤں؟ اگر چہ واقعہ صحیح ہے لیکن میں تو یہ چیزیں شمار کر کے نہیں لایا تو میں کیسے بتاؤں؟ اور مشرکین مکہ کو یہ بھی پتہ تھا کہ آپ ﷺ زندگی میں کبھی بیت المقدس نہیں گئے۔اس لیے وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ شاید پہلے کی دیکھی ہوئی ہو گی۔تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں بیت اللہ کے پاس حطیم میں کھڑا تھا جب انھوں نے میرے اوپر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔تو مجھے بڑا صدمہ ہوا اور میں نے سوچا کہ اب کیا کروں۔اگر ان کو جواب نہیں دیتا تو یہ کہیں گے کہ جھوٹ بولتا ہے کہ میں وہاں گیا تھا اور میں جواب کیسے دوں کیونکہ میں تو یہ چیزیں وہاں دیکھ کر نہیں آیا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فوراً میرے سامنے بیت المقدس نمایاں کر دیا۔درمیان کے پردے اٹھا دیئے۔جو سوالات وہ کرتے وہی سارا میرے سامنے آجاتا اور میں دیکھ کر بتا دیتا۔ (مشکوۃ 530/1 بخاری 684/2)

لو۔ آج آپ کی ٹی وی نے ان باتوں کا یقین دلا دیا۔ لیکن جب روحانیت کے طور پر یہ باتیں ہوتی تھیں تو لوگوں کو اعتماد نہیں آتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ دور بیٹھے بھی کسی چیز کو دیکھا جا سکتا ہے؟ دور بیٹھے بھی اللہ کسی کو کوئی چیز دکھا دیتے ہیں؟ تو یہ باتیں روحانیت کے درجے کی ہیں۔

اعتماد کی حقیقت

اس لیے جو باتیں روحانیت کے درجے کی ہیں۔ ان میں زیادہ عقل نہیں چلانی چاہیے۔ تو یہی اعتماد کی بات ہے جو قرآن میں ہے۔ کہ اے محبوب! جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری باتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

اعتماد کیا ہے؟ (یہ بات ذرا توجہ سے سنیں) وہ اعتماد یوں ہے کہ آپ ایک ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے آپ کا خون چیک کیا، بازو پہ پٹی لگا کر آپ کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ وہ کہتا ہے کہ آپ کے خون میں تو بہت شوگر ہے۔ خبردار! آئندہ میٹھا نہیں کھانا۔ تو اگرچہ آپ کی مٹھائی کی دکان ہے۔ لیکن ڈاکٹر کی بات پہ اعتماد کر کے آپ نے مٹھائی کھانی چھوڑ دی۔ حالانکہ آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ خون میں شوگر ہے۔ (یہ میں وہ بات کر رہا ہوں جو روزمرہ ہمارے سامنے پیش آتی ہے) مٹھائیوں کی دکان بھری پڑی ہے، اور آپ وہاں چوکڑی مار کے بیٹھے ہیں۔ لیکن نہیں کھاتے۔ کیوں؟ کہ ڈاکٹر نے کہ دیا ہے کہ تمہیں شوگر ہے۔ یہ ہے ڈاکٹر پر اعتماد۔

ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ تیرا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ تو نے نمک نہیں کھانا۔ اب آپ کو نہیں پتہ کہ بلڈ پریشر کیا ہوتا ہے؟۔ آپ کو نہیں پتہ کہ ہائی کیا ہوتا ہے؟۔ اس کے باوجود آپ نے نمک جیسی مزیدار چیز جس کے ساتھ ہر قسم کی کھانے کی چیز مزیدار بنتی ہے۔ آپ نے چھوڑ دی۔ کوئی آپ کو نمکین چیز دے تو آپ کہیں گے کہ میں نمکین چیز نہیں کھاتا۔ کیوں؟ کہ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تیرا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ اسی طرح میں میٹھا نہیں کھاتا۔ کیوں؟ کہ ڈاکٹر کہتا ہے تجھے شوگر ہے۔

دنیا کی پوری لذتیں آپ ڈاکٹر کے کہنے پر چھوڑ کے بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ ہے یا نہیں؟ یہ باتیں ہمارے ساتھ روز پیش آتی ہیں۔کوئی چیز سامنے آتی ہے تو ہم کہتے ہیں نا بھائی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ نقصان دیتی ہے۔ایک کڑوی اور پھیکی چیز۔ڈاکٹر کہتا ہے تیرے لیے مفید ہے۔یہ کھایا کرو۔تو ہم صبح، شام وہ کھاتے ہیں۔ابلی ہوئی سبزی کھاتے ہیں۔نمک قریب نہیں آنے دیتے۔مرچ مصالحہ قریب نہیں آنے دیتے۔کہ ڈاکٹر نے روکا ہوا ہے۔تو لذتیں ترک کردیں کھانا پینا چھوڑ دیا۔صرف ڈاکٹر کے کہنے پر حالانکہ نہ ہم نے بلڈ پریشر آنکھوں سے دیکھا۔نہ ہم نے شوگر آنکھوں سے دیکھی۔ محض ڈاکٹر پہ اعتماد ہے۔

کیا ہمیں حضور ﷺ پر اعتماد ہے؟

اور اتنا اعتماد ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے اس کی خلاف ورزی کی تو مر جاؤں گا۔یوں آپ پرہیز کرتے ہیں جس طرح سے آپ کو ڈر لگ رہا ہے اگر ہدایات کی خلاف ورزی کی تو مر جاؤں گا۔جیسے موت سے ڈرتے ہو۔اسی طرح سے بد پرہیزی سے ڈرتے ہو۔کیا اس طرح سے اعتماد اللہ اور اللہ کے رسول پہ ہے؟ کہ اللہ کا رسول کہتا ہے کہ پیشاب کے قطروں سے بچو۔ورنہ قبر میں عذاب ہوگا تو پھر آپ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ قبر کیا ہوتی ہے؟ عذاب کیا ہوتا ہے؟ اور پیشاب کا قبر کے عذاب سے کیا تعلق؟ کیا یہ اعتماد ہے؟ (نہیں)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ زکوۃ نہیں دو گے تو یہی خزانہ قیامت والے دن گنجا سانپ بن کر مسلط ہوگا کیا آپ کو اعتماد ہے؟ [بخاری 188/1]

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر نماز نہیں پڑھو گے تو اتنا عرصہ دوزخ میں جانا پڑے گا۔تو کیا آپ کو اس پر اعتماد ہے؟

ڈاکٹر کے کہنے پہ لذتیں چھوڑ سکتے ہیں، کھانا پینا چھوڑ سکتے ہیں، پوری زندگی کا نظام بدل سکتے ہیں۔کیا اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو معلوم کرنے کے بعد ہمارے

اندر یہ انقلاب آتا ہے؟

یہ مطلب ہے اس کا کہ جو ہماری باتوں پہ اعتماد کرتے ہیں جب وہ تیرے پاس آئیں تو انہیں کہو "السلام علیکم" لہٰذا سب سے پہلے ایمان ٹھیک کرو۔ ایمان ٹھیک ہوگا تو رسول اللہ ﷺ کا سلام پہنچے گا۔ ایمان ٹھیک ہوگا تو آپ کا سلام حضور ﷺ تک پہنچے گا۔ ورنہ اگر ایمان ٹھیک نہیں ہے تو کوئی بشارت نہیں۔

یہ ہمارے عمل ایمان کے لیے بطور علامت کے آتے ہیں اصل حقیقت ایمان ہے۔ جو قلب (دل) میں ہوتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں اعتماد۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں پر اعتماد کرنا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کہہ دیا کہ یہ نہیں کھانا۔ تو نہ کھائیں۔ انھوں نے کہہ دیا کہ یہ کھانا ہے تو کھائیں۔

انھوں نے کہہ دیا کہ اس وقت سونا ہے ورنہ یہ نقصان ہوگا۔ تو سوئیں۔ انھوں نے کہہ دیا کہ اس وقت جاگنا ہے تو جاگیں۔ انھوں نے کہہ دیا کہ آج نہیں کھانا یا آج کھانا ہے تو مومن ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس اعتماد کے ساتھ چلتے چلے جاؤ۔

اگر دل میں اتنا اعتماد آجائے کہ کوئی لذت لذت نہیں بس جس سے شریعت روک دے ہم اس کو چھوڑ دیں اور کوئی تکلیف تکلیف نہیں بس جس کو اللہ اور رسول ﷺ برداشت کرنے کیلئے کہیں تو ہم برداشت کریں۔

ایمان و اعتماد کے بغیر اعمال فضول ہیں۔

جب دل میں اعتماد کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ پھر اعمال میں جان پڑتی ہے۔ ورنہ اعمال بے جان ہوتے ہیں۔ آج ہی صبح کی نماز میں امام صاحب نے سورۃ نور کی جو آیات پڑھیں ہیں ان کے اندر آپ نے یہ بات اگر سمجھی ہوگی تو بہت اچھا کیا اگر نہیں سمجھی تو عرض کرتا ہوں کہ

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾

(سورۃ نور آیت نمبر 39)

جن کو ایمان کی دولت حاصل نہیں ہے۔ ان کے اعمال تو ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہوتی ہے کہ دور سے دیکھنے والا سمجھتا ہے یہ پانی ہے۔ آپ نے کبھی دیکھا ہو گا۔ دریاؤں کے کناروں پر، ریگستانوں میں، جب دیکھیں تو مٹی ایسے لگتی ہے جیسے پانی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ اس کو سراب کہتے ہیں تو ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں دیکھنے والا انکو پانی سمجھتا ہے۔

حَتّٰی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا

جب وہاں پہنچتے ہے تو کچھ نہیں ہوتا۔ تو ایمان سے خالی اعمال چمکتی ہوئی ریت ہیں۔ کتنا ہی تم اعتماد کرلو اور کہو کہ

- ☆ ہم نے اتنی نمازیں پڑھی ہیں۔
- ☆ ہم نے اتنے روزے رکھے ہیں۔
- ☆ ہم نے اتنی زکوۃ دی ہے۔
- ☆ ہم نے اتنے حج کیے ہیں۔
- ☆ ہم نے اتنی خدمت خلق کی ہے۔
- ☆ ہم نے اتنا جہاد کیا ہے۔
- ☆ ہم نے اللہ کے راستے میں اتنا مال خرچ کیا ہے۔
- ☆ ہم نے اتنی تلاوت کی ہے۔
- ☆ ہم نے اتنا ذکر کیا ہے۔

اگر ایمان دل کے اندر نہیں ہے تو یہ سارے اعمال چمکتی ہوئی ریت ہیں۔ آپ اس کو پانی سمجھتے رہو لیکن جب وہاں پہنچو گے تو دیکھو گے کہ کچھ بھی نہیں۔ یہ تو وہ کافر ہیں جن کو آخرت کا خیال ہے۔ ان کو تو چمکتی ہوئی ریت معلوم ہوتے ہیں اور جو دوسری قسم کے کافر ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن میں ہے۔

ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ

وہ تو ایسے ہیں جیسے کوئی آدمی سمندر میں غرق ہو یا ہوا ہو

☆ پانی کی تاریکی علیحدہ ....لہروں کی تاریکی علیحدہ۔

☆ بادل کی تاریکی علیحدہ ....رات کی تاریکی علیحدہ۔

﴿اِذَا اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا٥﴾ (نور 40)

اگر اپنا ہاتھ بھی دیکھنا چاہے تو ہاتھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ وہ کافر ہیں جن کو آخرت پہ یقین ہی نہیں۔ تو ان کے اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے

عشق کے مارے ہوئے

اس لیے پہلے ایمان کی فکر کرو، پہلے عقیدہ صحیح کرو۔ عقیدے کا صحیح ہونا ضروری ہے اور پھر اس کے بعد رسول ﷺ کے روضہ اقدس پر جائیں تو اللہ کی طرف سے کتنی قطعی بشارت ہے کہ جب یہ آئیں تو انہیں کہو کہ "السلام علیکم"

فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

تمہارے رب نے اپنے اوپر رحم کرنا لازم کر لیا ہے اور اللہ کے رحم کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ اگر کسی سے غلطی ہوگئی تو آج کہہ دو کہ یا اللہ! غلطی ہوگئی، معاف کر دے۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو بشارت دے دو۔

فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اللہ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے

یہ بشارت حاصل ہوتی ہے ایمان کی صحت کے بعد۔ ایمان سب سے پہلے ہے

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا

جو ہماری آیات پر اعتماد کرتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ایمان کی فکر کرو

☆ اللہ کی ذات وصفات کے متعلق صحیح عقیدہ۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی ذات وصفات کے متعلق صحیح عقیدہ۔

پہلے یہ ضروری ہے اور اس کے بعد یہاں آئیں ۔اصل کے اعتبار سے یہ بشارتیں سننے کیلئے ہم مدینہ آتے ہیں۔عشق کے مارے ہوئے یہاں آتے ہیں ورنہ سودا گروں کیلئے تو وہی جگہ اچھی ہے۔ یہاں تو عشق کے مارے ہوئے آتے ہیں۔ دیکھتے پھرتے ہیں کہ

☆ یہاں رسول اللہ ﷺ کی رہائش تھی۔

☆ یہاں رسول اللہ ﷺ نے غزوہ لڑا تھا۔

☆ یہاں رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے۔

☆ یہاں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام کیساتھ بیٹھتے تھے۔

ورنہ اب ان پتھروں کو اور ان مٹی کے ڈھیلوں کو دیکھنے کا کیا حاصل ہے؟ وہ تو یہی بات ہوتی ہے

اَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَ ذَا الْجِدَارَا
مَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ
لٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

مجنوں کہتا ہے کہ اگر میں کبھی لیلی کے دیار میں سے گزرتا ہوں۔تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں، کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں ۔ مجھے ان دیواروں سے محبت نہیں ہے۔بلکہ جوان دیواروں کے اندر رہتا ہے مجھے تو اس سے محبت ہے۔ہمارا بھی یہی حال ہوتا ہے

عقیدہ حیات النبی ﷺ

آخری بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں (اگر چہ میں نے اپنی ہمت سے زیادہ بول لیا) وہ یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ قبر میں حیات ہیں، ہمارا سلام سنتے ہیں- یہ تو خیر بہت ہی آگے کی بات ہے۔

ہمارا اور ہمارے اسلاف کا عقیدہ اور خود میرا عقیدہ۔ جیسے کہ سید انور شاہ کشمیریؒ فیض الباری میں ایک روایت لکھی اور اس کو صحیح قرار دیا کہ جس وقت کوئی شخص اپنے کسی عزیز، کسی دوست، ماں باپ، کسی استاد کی قبر پر جاتا ہے اور جا کر سلام کرتا ہے وہ قبر والا بھی سلام سنتا ہے۔ بلکہ یہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر پہلے دنیا میں جان پہچان ہو وہ پہچان بھی لیتا ہے کہ فلاں آیا ہے۔ اور اگر اس کو جان پہچان نہ ہو تو صرف سلام سنتا ہے۔ اور جواب دیتا ہے۔ اسی لیے قبرستان میں جاتے ہوئے آپ کو حکم ہے کہ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ مدینہ کی قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ)) (ترمذی 203/1 ،وقال حدیث حسن غریب)

تم سلام کہتے ہو یا نہیں کہتے؟ اور اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ تو جب عام میت سلام سنتی ہے تو سرور کائنات ﷺ تو بہت بڑی ہستی ہے اس کی تو بات ہی کیا ہے۔

افضل الکائنات

آج جس دور میں ہم گزر رہے ہیں اس دور میں دو تہذیبوں کی جنگ ہے۔ ایک وہ تہذیب ہے جو رسول اللہ ﷺ لائے اور انھوں نے ہمارے سامنے پیش کی۔ یہ تو آپ کا بھی عقیدہ ہے میرا بھی عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ افضل الکائنات ہیں۔ جو چیز کائنات میں موجود ہے اللہ کے سوا ہر چیز سے افضل ہیں۔ افضل المخلوقات ہیں۔ اللہ کا عرش بھی مخلوق ہے۔ آپ ﷺ اس سے بھی افضل ہیں۔

افضل الکائنات کی ہر چیز افضل

آپ تو عرش سے افضل ہیں ہی سہی۔ بلکہ انھوں نے (مولانا سعید احمد جلالپوری صاحب نے) تو بینات میں پورا مقالہ شائع کیا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قبر میں جس جگہ مدفون ہیں وہ قبر کا حصہ عرش الٰہی سے افضل ہے۔ اور اب جو فتاوی بینات چھپے ہیں

ان میں یہ مقالہ چھپ گیا ہے۔ با دلائل اور مفصل چھپا ہے اور بزرگوں کی طرف سے صراحت ہے۔ کیونکہ آخر عرش بھی تو مخلوق ہے اور جب آپ افضل المخلوقات ہیں تو عرش سے بھی افضل ہیں۔ اللہ کے بعد ہر چیز سے افضل ہیں۔

جب آپ افضل المخلوقات ہیں تو آپ ﷺ کی ہر چیز افضل ہے

☆ آپ ﷺ کی شکل سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کی عادت سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کا کردار سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کی نقل حرکت سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کی چال ڈھال سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کا قد وقامت سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کا نین نقش سب سے افضل۔
☆ آپ ﷺ کا لباس سب سے افضل۔

تہذیبوں کا ٹکراؤ

اور جو چیزیں کفر سے ناشی ہیں وہ ساری کی ساری ارذل ہیں۔ آج کا فر اپنی تہذیب ہم پر چڑھا رہے ہیں کہ ہماری تہذیب اختیار کرو اور ادھر رسول اللہ ﷺ کی تہذیب ہے۔

اب یہ مقابلے کی بات آگئی اب اگر کسی سے ہم کہیں کہ دیکھو بھائی! یہ عیسائیوں کا طریقہ ہے، یہ اختیار نہ کرو۔ یہ اسلامی طریقہ ہے، یہ اختیار کرو۔ وہ جواب میں کہے کہ عیسائیوں والا طریقہ اچھا لگتا ہے۔ اب اللہ معاف کرے صبح، صبح جب سکول کے بچے سکول میں جانے کیلئے نکلتے ہیں۔ چار، پانچ سال کے معصوم بچے، ان کے گلے میں بھی ٹائیاں لٹک رہی ہوتی ہیں۔ اور دیکھنے سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ مسلمانوں کے بچے ہیں یا عیسائیوں کے؟ اب

☆ ایک طرف عیسائیوں کی شکل ہے۔
☆ ایک طرف مسلمانوں کی شکل ہے۔
☆ ایک طرف عیسائیوں کا طور طریقہ ہے۔
☆ ایک طرف مسلمانوں کا طور طریقہ ہے۔

آج یہ ٹکراؤ ہے۔ یہ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو کہ یہ جو تھوڑے سے ٹوٹے پھوٹے مدرسے بچے ہوئے ہیں جنھوں نے اسلامی شکلیں اور اسلامی تعلیمات باقی رکھی ہوئی ہیں۔ ورنہ پورا کفر اس وقت اسلام کو مٹانے کیلئے اور اپنی تہذیب غالب کرنے کیلئے متحد ہے۔

ایک اشکال کا منہ توڑ جواب

اب کہتے ہیں کہ اگر ایسا کر لیا جائے تو اتنا سا کرنے میں کیا ہوا تا ہے۔ اسلام کوئی اسی میں رکھا ہوا ہے؟ ایمان اسی میں رکھا ہوا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ایک ملک کا مثلاً جھنڈا ہے۔ وہ کپڑے کا ٹکڑا ہی تو ہے۔ اپنے صدر صاحب کو کہو کہ اپنی گاڑی کے اوپر ایک دن انڈیا کا جھنڈا لگا کے ذرا چلیں۔ وہ کہیں گے۔ ہیں؟ انڈیا کا جھنڈا؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ہمارے دشمن ہیں۔ تو آپ اسے کہیں کہ بھائی! اتنا سا کپڑا لگانے میں کیا حرج ہے۔ اس سے کیا فرق پڑ جاتا ہے؟۔

عربوں کو کہو کہ تم اسرائیل کا جھنڈا لگا لو۔ کیا ہوتا ہے؟ ایک بالشت کپڑا ہی تو ہے

۔

اسی طرح زنانے مردانے کی تہذیب کا فرق آپ کرتے ہیں۔ ایک دن بیگم صاحبہ کا سوٹ پہن کے تو بازار میں آجاؤ۔ وہ بھی تو کپڑا ہی ہے۔

لیکن یہاں جس وقت تقابل ہوتا ہے انگریزی تہذیب کا اور ہماری تہذیب کا۔ وہاں انگریزی تہذیب اچھی لگتی ہے۔ اور اپنی تہذیب سے پیار نہیں۔

ہائے! محبوب ﷺ کا اعراض

واللہ العظیم۔ کسی کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔ نہ تحقیر کرنے کا کوئی حق ہے۔ کیونکہ جو لوگ یہاں (مدینہ) آئے ہیں سب حضور ﷺ کے مہمان ہیں۔ باغ میں پھول بھی ہوتے ہیں، اور کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہوتا سارا باغ ہے۔ ہمیں کسی کی تحقیر کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لیکن جس وقت سرور کائنات ﷺ کے دربار میں حاضری ہوتی ہو اور آپ ﷺ کے سامنے یہ بات آتی ہو۔ کہ

☆ امتی میرا ہے۔
☆ کلمہ میرا پڑھتا ہے۔
☆ لیکن تہذیب انگریزوں کی ہے۔
☆ تہذیب عیسائیوں کی ہے۔
☆ تہذیب یہودیوں کی ہے۔

تو میرا خیال ہے کہ حضور ﷺ کی طبیعت خوش نہیں ہوتی ہوگی۔ لازماً تکلیف ہوتی ہوگی۔

وہ تو اپنی زندگی میں کہتے تھے کہ جو لہسن، پیاز کھالے۔ جس کے منہ سے لہسن، پیاز کی بو آتی ہو وہ میری مسجد کے قریب نہ آئے۔

(بخاری 118/1 مسلم 209/1 مشکوۃ 68/1)

اسی مسئلے کے تحت فقہاء نے لکھا کہ لہسن پیاز کی خصوصیت نہیں بلکہ جو بھی بدبودار چیز آپ نے کھائی ہے اگر آپ مسجد نبوی ﷺ میں آئیں گے تو رسول اللہ ﷺ کیلئے باعث تکلیف ہے۔

بہت سارے مکاشفات ہیں۔ ابھی آپ کے سامنے ذکر کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ جن میں ہے یہ حقہ اور سگریٹ کی بو اگر کسی کے منہ سے آتی ہے تو رسول اللہ ﷺ

سے اعراض فرما لیتے ہیں۔ توجہ نہیں فرماتے۔ اگر لہسن، پیاز کی بو برداشت نہیں تو یہ بو کیا اس سے کم ہوتی ہے؟

تو ہماری شکل وصورت سنت کے مطابق ہو اور جس طرح سے عشق کا مارا ہوا اپنی معشوق کی صورت بنا کے آتا ہے۔ تو اس طرح اگر آئیں تو رسول اللہ ﷺ کی طبیعت خوش ہوتی ہے۔ اور پھر لازماً بشارت ہوتی ہوگی۔ ''السلام علیکم'' اور جس کی

☆ شکل وصورت دشمنوں جیسی ہو۔
☆ تہذیب وتمدن دشمنوں جیسا ہو۔
☆ اخلاق وکردار دشمنوں جیسا ہو۔
☆ منہ سے بدبو آرہی ہو۔

تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب جاتے ہوں گے۔ تو اللہ معاف فرمائے۔ ہوسکتا ہے یوں اعراض ہی کرلیں تو ہمارے پلے کیا رہ گیا؟ اگر یہاں آئے بھی اور اتنی مصیبتیں بھی اٹھائیں اور رسول اللہ ﷺ نے توجہ نہ فرمائی تو ہمارے پلے کیا رہ جائے گا۔

ہم کس میدان میں کھڑے ہیں؟

اس لیے اس دور میں اس بات کی رعایت رکھنا بہت ضروری ہے۔ اسلامی تہذیب کے اوپر فدا ہو جاؤ اور اپنی ہر چیز کے اندر اسلامی تہذیب کو نمایاں کرو۔ اور جہاں تک ہو سکے یہود نصاریٰ، ہندو، سکھ جتنے بھی کافر ہیں سب کی تہذیبوں سے بچنے کی کوشش کرو۔ آج زبردست مقابلہ ہے اور انشاء اللہ العزیز آخر کار کامیاب تو رسول اللہ ﷺ کی تہذیب نے ہی ہونا ہے۔ لیکن خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس جنگ کے اندر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے میدان میں کھڑے ہیں۔ ورنہ نتیجہ تو بہر حال اسی حق میں نکلنا ہے۔

کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ کی تہذیب مٹ گئی تو دنیا ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور

قیامت آجائے گی ۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اتباع سنت اختیار کریں اور رسول اللہ ﷺ کے روضہ اقدس پر ایسی صورت میں جائیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے خوش ہوں اور ہمارے لیے دعائیں کریں اور آپ کا مزاج ہمیں دیکھ کر منبسط ہو۔ یہ ہمیں دعا کرنی چاہیے اور استغفار کی کثرت اور درود شریف کی کثرت بہت ضروری ہے۔ اور

ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ

جو توبہ کرلے اور اپنی زندگی کو درست کرلے کہ یا اللہ! جو غلطی ہو چکی، سو ہو چکی۔ ہم توبہ کرتے ہیں۔ آئندہ نہیں کریں گے تو رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے کہ ان کہہ دو

فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

شیخ جیلانی رحمۃ اللہ کا دل سوز واقعہ

اور گناہوں کی بخشش ہی اصل ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ عبد القادر جیلانی کو دیکھا۔ مکہ معظمہ میں کنکریوں کے اوپر سر رکھا ہوا تھا (آپ میں سے پرانے لوگوں نے دیکھا ہوگا اور میں نے بھی دیکھا ہوا ہے کہ یہاں پہلے بیت اللہ کے اردگرد کنکریاں ہوا کرتی تھیں، فرش نہیں ہوتا تھا) تو کنکریوں کے اوپر سر رکھا ہوا تھا اور رو رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے۔ (شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اصل زبان بھی فارسی ہے) وہ کہہ رہے تھے

من نگویم بطاعتم بپذیر
قلم عفو بر گناہم کش

یا اللہ! میں یہ نہیں کہتا کہ میری نیکیاں قبول کرلے۔ میں تو یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے گناہوں پر عفو (معافی) کا قلم پھیر دے۔ باقی ہماری نیکی اس دربار کے لائق کہاں ہے؟ حقیقت میں بات تو دہی ہے۔

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب تیسری مرتبہ گئے تھے یوسف علیہ السلام کے دربار میں ۔تو جو کچھ گھر میں ٹوٹا پھوٹا سازوسامان تھا وہ لے گئے اور جا کر کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم لے کر آئے ہیں یہ تو دھتکار دینے کے قابل ہے۔شاہی دربار کے لائق کہاں ہے؟ ہم پہ صدقہ کر دے۔ یہ جو کھوٹی پونجی لے کر آئے ہیں اسی کی بناء پر غلہ دے دے۔تو وہی بات ہے کہ ٹوٹی پھوٹی اور جو ہے وہ بھی تیری توفیق سے ہے اب لے کر آگئے ہیں۔لیکن ہماری غلطیوں کو معاف کر دے۔

توبہ کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرو اور آئندہ کیلئے اپنے ہ''ت کی اصلاح کرو۔پھر بشارت ہے کہ فانه غفور رحیم

اللہ تعالیٰ ہم سب کی حاضری کو قبول فرمائے اور اس حاضری کو ہمارے لیے مغفرت ذنوب (گناہوں کی بخشش) کا ذریعہ بنائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

علم کے تقاضے

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (سورہ بقرہ. آیت.۴۴)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ وَعَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰى

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ

❁❁❁❁❁

تمہید

قرآن کریم کی قراءت سننے کے متعلق جو جذبہ ہے۔ وہ میرے سامنے ہے۔ میں نے اس لیے جلدی سے کرسی پہ قبضہ کرلیا کہ اگر میں ان (قاری ادریس آصف صاحب) کی قراءت پہلے کرواتا ہوں تو ان کو ذرا جلدی فارغ ہونا پڑے گا۔ اور لمبی قراءت کیلئے بیٹھنے میں میرے میں ہمت نہیں۔

آج طبیعت کچھ بحال نہیں۔ اس لیے عشاء کے قریب تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آج کیا بیان کروں۔ کیونکہ پچھلے منگل بھی ناغہ ہوگیا تھا۔ اس لیے خیال کیا کہ چلو کچھ

- اپنے آپ کو
- اپنے بھائیوں کو
- اپنے ساتھیوں کو
- اپنے بچوں کو

مختصر سی نصیحت کر دیتا ہوں۔ اور بعد میں یہ کرسی قاری صاحب کیلئے فارغ کروں۔ اور انکی خدمت میں میں نے عرض کر دیا ہے کہ پھر وہ اتنی لمبی قراءت کریں کہ ہمارے طالب علموں کا جی بھر جائے۔ اس لیے آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ آج میں جلدی سے کرسی پہ کیوں چڑھ کے بیٹھ گیا اور جلدی بیان کیوں شروع کر دیا؟۔ تو آپ کا شوق پورا کرنے کیلئے ایسا کیا ہے۔

یہود ونصاریٰ کی بیماریاں:

قرآن کریم کی یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ اہل علم کیلئے اللہ کی طرف سے ہدایت ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ کچھ اپنے آپ کو نصیحت اور کچھ آپ حضرات کو۔

اس آیت میں اہل کتاب کا، یہود ونصاریٰ کا تذکرہ ہے۔ جن کے پاس اللہ کی

کتاب تھی، تورات وانجیل۔اور وہ تورات وانجیل پڑھتے بھی تھے۔ لیکن پڑھنے کے ساتھ ساتھ خواہشات کی اتباع ان کے اندر اتنی تھی۔ کہ اپنی خواہشات کی پیروی میں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ جیسے خود قرآن کریم میں ہے۔

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (سورہ بقرہ آیت ۸۷)

''کہ جب تمہارے پاس اللہ کا کوئی رسول ایسی بات لے کے آگیا۔ جو تمہاری خواہش کے مطابق نہیں تھی۔ تو تم اکڑ گئے، بات نہیں مانی، رسولوں میں سے ایک فریق کو تو تم نے جھوٹا کہا، تکذیب کردی، اور ایک فریق کو تو قتل ہی کر دیا''۔

یعنی اپنی خواہش کے خلاف تم میں بات سننے کی بھی ہمت نہیں۔ چاہے اللہ کا رسول ہی کہہ رہا ہو۔ اگر تمہاری خواہش کے خلاف ہے۔ تو تم اکڑ جاتے ہو۔ تو پھر یوں ہوا کہ ایک فریق کو تو تم نے جھٹلایا اور حد سے زیادتی یہ ہوئی کہ ایک فریق تو قتل ہی کر دیا۔

﴿يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ (سورہ آل عمران آیت ۲۱)

یہ اہل کتاب کے بارے میں قرآن کریم میں ہے۔ قتل کیوں کرتے تھے؟۔ اس لیے کرتے تھے کہ انبیاء، ان کو ایسی بات کہتے تھے جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تھی۔ تو اپنی خواہش کے خلاف بات کو نہ سننا، اپنی خواہش کے خلاف بات کو برداشت نہ کرنا، چاہے اللہ کے رسول کی زبان سے ہی ہو، یہ خصلت یہودیوں کی ہے۔

علماء اہل کتاب کی بیماری:

اور یہ آیت جو میں نے پڑھی۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو یہی ملامت کرتے ہیں۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾

کیا لوگوں کو تو تم بھلائی سکھاتے ہو کہ نیکی کرو، جب لوگوں کے سامنے وعظ کہتے ہو تو خدا سے ڈرنے کے لیے کہتے ہو، نیکی کرنے کے لیے کہتے ہو، بھلائی کی تلقین کرتے ہو

﴿ وَتَنسَوْنَ اَنفُسَكُم ﴾ (سورہ بقرہ۔آیت۔۴۴)

اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو۔ نیکی کرنا تمہیں یاد نہیں ہے؟۔

حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کتاب پڑھتے ہو۔ کتاب تو کہتی ہے کہ جو علم ہے اس کے مطابق عمل کرو۔ تم کتاب پڑھتے ہو۔ لیکن پڑھے ہوئے کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ لوگوں کو مسئلے بتاتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ نے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ لوگوں کے سامنے تو اچھی اچھی باتیں کرنا، ان کو تو اچھی اچھی باتیں بتانا، لیکن اپنے آپ کو بھول جانا اور اپنے آپ کو نیکی کی طرف نہ لگانا، یہ خصلت بھی یہودیوں کی ہے۔ اور یہود کی یہ عادت تھی۔

ان دونوں باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی بات جب اپنے علم میں آجائے۔ تو انسان کو چاہیے کہ دوسروں کو تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس پر عمل کرے۔ اپنے آپ کو بھول نہیں جانا چاہیے۔ تو علم پر عمل کرنا یہ اللہ کی کتاب کا تقاضا ہے۔ اور یہ اچھے لوگوں کی عادت ہے۔ اور علم پر عمل نہ کرنا، لوگوں کو اچھی باتیں کہنا اور خود ان پر عمل نہ کرنا، اور اپنے آپ کو بھول جانا، یا اپنی خواہش کے مطابق بات ہو تو اس کو قبول کر لینا اور اگر اپنی خواہش کے مطابق بات نہ ہو تو اس کو قبول نہ کرنا، یہ عادت عیسائیوں اور یہودیوں کی ہے، امتِ محمدیہ کی عادت نہیں ہے۔

علم بذاتِ خود مقصود نہیں:

امت محمدیہ کا مزاج یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ چاہے اپنی مرضی کے موافق ہو، چاہے اپنی مرضی کے خلاف ہو۔

اس لیے علم والوں کے اوپر یہ ذمہ داری زیادہ آتی ہے کہ وہ اپنے علم کے اوپر عمل بھی کریں۔ یاد رکھیے! علم بذات خود مقصود نہیں ہے۔ علم عمل کیلئے مقصود ہے۔ اگر علم بذات خود ہی مقصود ہوتا تو میرا جہاں تک خیال ہے۔ اس وقت ہم سب جو موجود ہیں۔ ہم سب کے مقابلے میں شیطان سب سے بڑا عالم ہے۔ اس لیے کہ اس نے

- تمام انبیاء کی تقریریں سنی ہوئی ہیں۔
- تمام علماء کی مجلسوں میں بیٹھا ہوا ہے۔
- تمام بزرگوں کے وعظ سنے ہوئے ہیں۔

اور اتنا لمبا چوڑا اس کا تجربہ ہے۔ کہ جس کو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

- کتنی معلومات اس کے پاس ہیں۔
- کتنا اس نے انبیاء علیہم السلام کو دیکھا ہوا ہے۔
- کتنے ان کے وعظ و تقریریں سنی ہوئی ہیں۔

اس وقت ہمارے سب کے مقابلے میں بڑا عالم شیطان ہے۔ اسی لیے تو وہ علماء کو بھی مغالطہ دے دیتا ہے۔ علماء کو بھی گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن اس کا علم کیا کام آیا جب اس نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا۔

اس وقت یہود و نصاریٰ میں ایک گروہ ہے جن کو مستشرقین کہتے ہیں۔ مستشرقین کا معنی ہے علوم شرقیہ کے ماہر، تو علوم شرقیہ میں مسلمانوں کے یہ سارے علوم بھی آتے ہیں۔ آپ یقین جانیے! کہ یہود و نصاریٰ میں قرآن و حدیث کے اتنے بڑے بڑے عالم موجود ہیں کہ ہم بھی ان کے سامنے کچھ نہیں ہیں۔ پورے ذخیرہ حدیث کے اوپر ان کو عبور ہے۔ اور پورے ذخیرہ حدیث کی لغات انہوں نے مرتب کی ہوئی ہیں۔ حدیث سے حوالے مرتب کر کے سب کمپیوٹر پر چڑھا دیے کہ یہ روایت

- کس کس کتاب میں موجود ہے۔
- کس کس جلد میں موجود ہے

اہل علم کی تعریف بزبانِ صحابی:

ایک روایت پیش کر کے ختم کرتا ہوں۔ مشکوۃ شریف کتاب العلم، تیسری فصل میں صاحب مشکوۃ نے حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے۔

((عَنْ سُفْيَانَ قَالَ اِنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ رَضِىَ الله عنه سَئَلَ كَعْبَ الاَحبَارَ))

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب احبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔(کعب احبار رضی اللہ عنہ یہ بہت بڑے یہودی عالم تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ چونکہ یہ تورات وانجیل کے بہت ماہر تھے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کبھی کبھی ان کے ساتھ معلومات کا تبادلہ کرتے تھے۔) تو ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ

"مَنْ اَرْبَابُ الْعِلْمِ"

ارباب العلم کون ہیں؟۔ یعنی علم والے کن کو کہا جاتا ہے؟۔ تورات وانجیل کی روشنی میں تم کیا سمجھتے ہو کہ علم والے کون لوگ ہیں؟۔ اللہ کی کتاب میں علم والوں کی جو فضیلت آتی ہے علم والوں کی وہ فضیلت کن کیلئے ہے؟۔ تو کعب احبار رضی اللہ عنہ نے جواب دیا

"اَلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْن بِمَا يَعْلَمُوْنَ" (مشکوۃ۔۱/۳۷)

ارباب العلم کہلانے کے حق دار وہ ہیں جو عمل کرتے ہیں۔ ان باتوں پر جن کو جانتے ہیں۔ اور اگر صرف جانتے ہوں۔ عمل نہ کرتے ہوں وہ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ارباب العلم نہیں ہیں۔

تو فضائل پڑھ پڑھ کر ہمیشہ اپنے اوپر منطبق نہیں کرنے چاہییں۔ فضیلت آپ کے اوپر تبھی صادق آئے گی۔ جب علم کے مطابق عمل بھی ہو۔

اس لیے یہ جذبہ علم کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنا چاہیے کہ جیسے انسان علم حاصل

کرتا چلا جائے اس کے دل میں عمل کا جذبہ بھی ویسے ہی آتا چلا جائے۔

لالچ علم کیلئے وبال ہے:

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔ اگلہ جملہ بھی سن لیجئے۔

حضرت عمر نے پوچھا۔

((مَا اَخرَجَ العِلمَ عَن قُلُوبِ العُلَمَاءِ))

وہ کون سی بیماری ہے؟۔ جو علماء کے دل سے علم کو ختم کر دیتی ہے۔ اس کا نور ختم کر دیتی ہے۔ اسکی رونق ختم کر دیتی ہے۔

((قَالَ اَلطَّمَعُ))

تو کعب احبار رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ لالچ، دنیا کی طمع، یہ چیز ایسی ہے کہ جس دل کے اندر دنیا کا لالچ موجود ہو۔ یوں سمجھو کہ علم الٰہی اس دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔ اور اس دل سے نکل جاتا ہے۔ تو گویا کہ علم کے دل کے اندر راسخ ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے دل میں آخرت کی محبت ہو، دنیا کی محبت اور مال کی طمع نہ ہو۔ جس شخص کے دل میں دنیا کی محبت اور مال کی طمع آ گئی۔ تو وہ شخص یوں سمجھو کہ علم کی نورانیت سے محروم ہو گیا۔ اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اہل علم کی شان اسی میں ہے کہ طمع اور لالچ ان کے قریب سے نہ پھٹکے۔ ورنہ جس وقت بھی اہل علم لوگوں کی نظر میں ذلیل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ذلیل ہوتے ہیں۔ کہ ان کے طرزِ عمل سے، ان کی باتوں سے لالچ ٹپکتا ہے۔ اور جب لالچ ٹپکتا ہے تو لوگوں کی نگاہ میں گر جاتے ہیں۔ پھر مشہور ہو جاتا ہے کہ یہ تو کھانے پینے کے یار ہیں۔ باقی عظمت ختم ہو جاتی ہے۔

اس لیے قرآن کہتا ہے۔

﴿وَ مَن يُوقَ شُحَّ نَفسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾

(سورہ حشر آیت ۹۔ سورہ تغابن آیت ۱۶)

''جو نفس کے شح سے بچا لیا گیا۔ وہ کامیاب ہونے والا ہے۔ تو ''شح'' کی چیز

ہے؟۔

شح اصل کے اعتبار سے قلب کی ایک کیفیت ہے۔ (یہ موضوع ایک مستقل ہے کہ قلب کی اصلاح کس طرح سے ہوتی ہے؟۔ اچھی صفات کیسے پیدا ہوتی ہے؟۔ اس کا تعلق تصوف سے ہے۔ وہ اگر اللہ توفیق دے گا تو کبھی آپ کے سامنے ان شاء اللہ تفصیل سے بیان کریں گے)

''شح'' ایک کیفیت ہے جو ناشی (پیدا ہونے والی) ہے حُبِّ مال سے۔ جب انسان کے دل میں مال کی محبت آجائے تو قلب (دل) کے اندر دو قسم کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

- ایک یہ کہ زیادہ سے زیادہ مال آئے۔
- اور دوسرا حال یہ طاری ہوتا ہے کہ جو آیا ہے وہ جائے نہ۔

زیادہ سے زیادہ آنے کا اثر، اس کو حرص کہتے ہیں اور'' جائے نہ'' اس جذبے کو بخل کہتے ہیں۔ گویا کہ شح اسے کہتے ہیں۔ کہ دل میں یہ جذبہ ہو۔ مجھے زیادہ سے زیادہ مال حاصل ہو۔ اور جو میرے پاس ہے وہ جائے نہ۔ اس لیے شح، بخل کے معنی بھی آتا ہے اور حرص کے معنی میں بھی آتا ہے۔ موقع محل کے مطابق اس کا معنی بخل بھی کرتے ہیں اور موقع محل کے مطابق اس کا معنی حرص کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ اصل کے اعتبار سے یہ ایک کیفیت ہے جو حبِ مال سے ناشی ہوتی ہے۔

تو اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ

- ان کا کردار ....ان کی گفتار
- ان کے معاملات ....ان کا طرزِ تکلم
- ان کا اندازِ گفتگو.........ان کی چال ڈھال
- ان کا رہن سہن ....ان کا میل جول

،سب اس بات پہ دلالت کرے کہ ہمارے دل میں دنیا کی محبت نہیں۔ ہم جو کچھ

کرتے ہیں، دنیا کیلئے نہیں کرتے۔ اور ہمارے دل کے اندر یہ لالچ نہیں۔ ہر وقت ہماری زبان ٹپکتی نہیں ہے، رالیں نہیں چھوڑتی۔ کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ بس اس کو تو کھانے پینے کیلئے ہی چاہیے۔ کیونکہ یہ اہل علم کی شان نہیں ہے۔ اس لیے طالب علم ہوں، علماء ہوں، سب کو اس بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ کہ دوسرا آدمی ہمیں حریص، طماع نہ سمجھے۔ ورنہ دل سے علم کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت حکیم العصر کی شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت:

مجھے چونکہ طالب علمی زمانے سے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بہت عقیدت ہے۔ میں ان کی باتیں بہت یاد رکھتا ہوں۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ میں طالب علمی زمانے میں تقریباً گلستاں کا حافظ تھا۔ مجھے گلستاں اتنی یاد تھی جیسے حافظوں کو قرآن یاد ہوتا ہے۔ اول سے لے کے آخر تک جتنی حکایتیں ہیں، اشعار ہیں، چلتے پھرتے گنگناتے رہنا، پڑھتے رہنا، یہ میری عام عادت تھی۔ اس لیے گفتگو میں میں ان کے حوالے بہت دیا کرتا تھا۔ اور شیخ سے مجھے بہت محبت ہے۔ اور بہت زیادہ تعلق ہے۔ اسی وجہ سے جب بھی کوئی کام یا واقعہ پیش آجائے تو مجھے اس بابے کی کوئی نہ کوئی نصیحت یاد آجاتی ہے۔

تو اسی مناسبت کا نتیجہ کہہ لیجئے۔ (گلستان، بوستاں میں بہت کام کی باتیں ہیں۔ آپ لوگ ان کو سمجھ کے پڑھتے نہیں ہیں۔) اظہار کرتے ہوئے کچھ خیال بھی آتا ہے، ڈر بھی لگتا ہے۔ کہ اس کا کوئی اور بھی مطلب نہ سمجھ لینا کہ اپنی تعریف کرنا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ شرِ نفس سے محفوظ رکھے۔ تعریف کرنا مقصود نہیں ہے۔ آپ کو ایک بات سمجھانی مقصود ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات:

آج سے ۴۶ سال پہلے کی بات ہے۔ کہ جب میں قاسم العلوم میں مدرس تھا۔ تو میرا تعلق حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ انہوں نے ذکر کی

تلقین کی ہوئی تھی۔ تو میں نے اپنے لیے ہزار دانے کی تسبیح بنائی ہوئی تھی۔

(میرا خیال ہے۔ میرے پاس یہاں بھی رہی ہے۔ غالباً مولانا منیر احمد صاحب نے مجھ سے لی تھی۔) تو ایک رات صبح تہجد کے وقت میں نماز سے فارغ ہو کر۔ میں معمول کے مطابق بیٹھا ذکر کر رہا تھا۔ نہ کوئی وہم، نہ کوئی خیال۔ یعنی میں شیخ سعدی کو یاد کر رہا ہوں۔ یا شیخ سعدی کی کوئی بات سمجھ نہ آ رہی ہو، ایسی بالکل کوئی بات نہیں تھی۔ ذکر کر رہا ہوں۔ اور وہ ہزار دانہ تسبیح میرے ہاتھ میں تھی۔ تو یکدم اس طرح سے ہوا۔ جس طرح سے شیخ سعدی رحمہ اللہ آ دھمکے اور آ کے مجھے کہتے ہیں۔ (ایسے جیسے بالمشافہ بات ہو رہی ہو اور گویا میں اپنے کانوں سے سن رہا ہوں۔ اتنا حال طاری ہوا۔ اگرچہ شعر تو گلستاں کا تھا۔ مجھے یاد بھی تھا۔ لیکن اس وقت استحضار نہیں تھا۔) ایسے ہوا جیسے مجھے آ کے کہتے ہیں۔

دست از طمع بریچ ار مردی
تسبیح ہزار دانہ بر دست مپیچ

بہادری اس میں ہے کہ اپنے ہاتھ کو طمع سے روک لو۔ ہزار دانہ تسبیح پھیرو نہ پھیرو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یعنی یقین جانیے! میرے اوپر ایسا حال طاری ہوا کہ میرے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔ کہ سعدی نے کیا کہہ دیا؟

مطلب یہ ہے کہ اگر طمع دل کے اندر موجود ہے تو ہزار دانہ وزنی تسبیح کے ساتھ اللہ اللہ کرتے رہو۔ کوئی فائدہ نہیں۔ دل سے طمع نکال دو۔ ہزار دانے کی تسبیح نہیں بھی پڑھو گے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بہت بڑی قیمتی نصیحت تھی۔ کہ ایک آدمی اللہ اللہ کرتا ہے۔ ہزار دانے کی تسبیح رکھی ہوئی ہے۔ ہزار دفعہ " لا الٰہ الا اللہ" پڑھتا ہے۔ ہزار دفعہ اللہ اللہ کرتا ہے۔ لیکن دل میں دنیا کی طمع ہے، دنیا کی حرص ہے تو یہ کھوکھلا ذکر ہے۔ کھوکھلی عبادت ہے۔ اس میں کچھ نہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں جو میں نے آپ کے

سامنے ذکر کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں۔ کعب احبار رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں۔ کہ طمع، اہل علم کے دل سے علم کی روشنی کو ختم کر دیتی ہے۔ علم کی روشنی نکال دیتی ہے۔

تو جس قلب کے اندر دنیا کی طمع ہو، دنیا کی ہوس ہو، اسکو "اللہ۔اللہ" کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جانے کے بعد اس کی علامت یہ ہوتی ہے۔ کہ انسان کے دل میں آخرت کا شوق ہوتا ہے۔ دنیا کی طمع نہیں ہوتی۔ یہ اہل علم کیلئے خصوصیت کے ساتھ نصیحت ہے۔ کہ جوانی میں ہی اس صفت کو اپناؤ، بڑھاپے کے اندر جوانی کی عادتیں عروج پہ پہنچ جاتی ہیں۔ پھر دل سے ان کو نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آج ہی ترمذی شریف میں ہمارے ہاں روایت آئی تھی۔

"يَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَيَشِبُّ مِنْهُ اثْنَتَانِ"

انسان بوڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں دو عادتیں بڑھ جاتی ہے۔ جوان ہو جاتی ہیں۔ جیسے جیسے وہ بڈھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ دو عادتیں جوان ہوتی چلی جاتی ہیں۔

((الحِرْصُ عَلَى المَالِ والحِرْصُ عَلَى العُمَرِ))

"ایک تو عمر کی حرص بڑھتی جاتی ہے۔ کہ جی چاہتا ہے کچھ اور عمر مل جائے۔ جلدی نہ مروں۔ بیٹوں کی شادیاں کرلوں۔ بیٹیوں کو بیاہ لوں۔ نواسے آگئے۔ پوتے آگئے۔ پھر ان کا سوچنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے آگے سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان کے دل میں یہ طمع زیادہ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ حرص علی المال بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حرص علی العمر بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

(مسلم ۱/ ۳۳۵۔ مشکوۃ ۱/ ۴۴۹۔ ترمذی ۲/ ۷۲)

جہانگیر اور شیخ سلیم چشتی رحمہ اللہ کا واقعہ:

اس پر میں آپ کو ایک لطیفہ سنا دوں۔ مغلیہ خاندان کے زمانے میں ایک چشتی خاندان کے بزرگ تھے سلیم چشتی۔ اور اکبر بادشاہ ان کا بہت معتقد تھا۔ یہ اکبر بہت بڑا درویش تھا۔ بعد میں اس کو دنیا دار مولویوں نے خراب کیا ہے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہونا

چاہیے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں۔

((اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَیرَ الخَیرِ خِیَارُ الْعُلَمَاءِ))

"دنیا کی بدترین چیزوں میں سے سب سے بدتر برا عالم ہے۔ اور دنیا کی اچھی چیزوں میں سے سب سے اچھی چیز اچھا عالم ہے۔" (مشکوۃ ۱/ ۳۷)

کیونکہ جب عالم بگڑتا ہے تو اکیلا نہیں بگڑتا۔ بلکہ سینکڑوں، ہزاروں کو ساتھ بگاڑ دیتا ہے۔ گمراہی پھیلانا اور نیکی پھیلانا یہ علماء کا ہی کام ہے۔ جاہل نے کیا گمراہی پھیلانی ہے۔ اور اس نے کیا نیکی پھیلانی ہے؟۔

تو اچھے اور برے دونوں قسم کے علماء ہوتے ہیں۔ تو اکبر کو گمراہ کرنے والے یہ فیضی، ابوالفضل، یہ بہت بڑے عالم تھے جنہوں نے اکبر کو گمراہ کیا تھا۔

ورنہ پہلے پہلے بہت درویش تھا۔ اور علماء کا معتقد تھا۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ اس کے بیٹے جہانگیر کا نام سلیم ہے۔ اور بیٹے کا یہ نام اکبر نے اپنے شیخ کے نام پہ رکھا تھا۔ یعنی سلیم چشتی جن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

تو ایک دفعہ بادشاہ اکبر، سلیم چشتی کی خانقاہ میں گیا۔ اور جو پرانے اولیاء ہوا کرتے تھے وہ رہتے اپنی جھونپڑیوں میں تھے۔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہمارے ہاں دنیا کی قدر نہیں ہے۔ ہم تو دیندار اور دین کی قدر کرنے والے ہیں۔ اسی لیے خانقاہوں میں جا کے دنیا کی محبت ختم ہوتی تھی۔ آخرت کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

بادشاہ مجلس میں بیٹھا تھا۔ تو کہتے ہیں کہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ ٹانگیں پھیلا کے بیٹھ گئے۔ جس طرح سے بے تکلف اپنے چھوٹوں کے سامنے آدمی ٹانگیں پھیلا کے بیٹھ جاتا ہے۔ تو ایک تھا ساتھ کوئی یہ پلیٹ چاٹنے والے اس قسم کے لوگ کچھ نہ کچھ تو بڑوں کے ساتھ ہوتے ہی ہیں۔ چاٹو قسم کے لوگ۔ تو اس قسم کا ایک آدمی ساتھ تھا۔ اس نے فوراً اعتراض کیا یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بادشاہ کے سامنے ٹانگیں پھیلا کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور

یہ بادشاہ کی بے ادبی ہے۔ کہتا ہے کہ حضرت یہ ٹانگیں پھیلانے کی عادت کب سے اختیار کرلی؟۔تو وہ فوراً کہنے لگے

"جب سے ہاتھ بغل میں لے لیے"

سوال اور جواب سمجھے؟ جنہوں نے ہاتھ پھیلانا ہو۔ وہ ٹانگ نہیں پھیلا سکتے۔ جنہوں نے ہاتھ بغل میں لے لیے وہ ٹانگیں پھیلائیں گے...... تو وہ فوراً چپ ہوگیا۔

بادشاہ نے حضرت کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی۔ (جیسے اس زمانے میں رواج تھا۔آج کی طرح کاغذ کے نوٹ تو ہوتے نہیں تھے۔ کہ مصافحہ کرتے ہوئے ہزار کا نوٹ دے دیتے ہیں۔ پتہ بھی نہیں چلتا۔ یا دینے والے کو پتہ ہوتا ہے۔ یا لینے والے کو پتہ ہوتا ہے۔ کسی اور کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کیا دیا ہے؟ کیا نہیں دیا؟۔تو اس وقت ایسے نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت سونے، چاندی کے سکوں کی اشرفیاں ہوتی تھیں۔

اس لیے اگر ہزار روپے کسی کو دینے ہوتے تو کافی بڑی تھیلی بن جاتی۔ ۸۰ روپے کا تو آپ یوں سمجھیں کہ ایک کلو وزن ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ایک تولے کا روپیہ ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی ہوتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا ہے۔ خالص چاندی کے ہوتے تھے۔تو ۸۰ تولے سے سیر بن جاتا ہے۔

اب ۸۰ روپے کسی کو دینے ہوتے تھے تو ایک سیر وزن ہو جاتا تھا۔ ہزار دینا ہو تو وزن تقریباً ۱۲ سیر ہو جائے گا۔ جب بادشاہ نے تھیلی پیش کی تو مولانا سلیم چشتی رحمہ اللہ نے کہا کہ ضرورت نہیں ہے۔ واپس لے جاو۔ تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کو پھر شرارت سوجھی۔ کہتے ہیں کہ جی! آپ اوپر اوپر سے کہہ رہے ہیں کہ میں نہیں لیتا۔ ورنہ آپ کے دل میں تو یقیناً شوق ہے لینے کا۔ دل میں تو آپ چاہتے ہوں گے کہ پیسے ملیں۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے کیسے پتہ چلا؟۔ کہ میں اوپر اوپر سے انکار کرتا ہوں اور میرے دل میں چاہت ہے۔ کہنے لگے حدیث میں آتا ہے۔

"يَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَيَشِبُّ مِنْهُ اثْنَتَانِ"

انسان بڑھا ہوتا ہے تو اسکی دو خصلتیں جوان ہو جاتی ہیں۔ ایک مال کی حرص، ایک عمر کی حرص۔ تو آپ بھی بڑھے ہیں۔ تو حدیث کی رو سے آپ کے اندر حرص علی المال تو ہوگا۔ تو حدیث سے دلیل دے دی۔

حضرت فرمانے لگے۔

مولوی گشتی و آگاہ نیستی

کہ مولوی تو بن گئے ہو۔ لیکن پتہ کسی چیز کا نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ہے "يَشِبُّ" جوان ہو جاتی ہیں۔ مولوی صاحب! جوان وہ چیز ہوا کرتی ہے جو پیدا تو ہوئی ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس دل میں حرص پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اس نے جوان کیا ہونا ہے؟۔ اگر پہلے دل میں حرص موجود ہو تو جیسے جیسے عمر بڑھتی جائے گی، حرص جوان ہوتی چلی جائے گی۔

اس لیے یہ عمر جو آپ حضرات کی ہے۔ اسی عمر میں ہی انسان اپنے دل سے بری باتیں نکالے، اچھے جذبات پیدا کرے، تو جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جائے گا تو وہی خصلتیں جو دل کے اندر جمی ہوئی ہوں گی۔ وہی مضبوط ہوتی چلی جائیں گے۔ اور اگر دل کے اندر کوئی بری خصلت ہوگی تو جیسے بوڑھے ہوتے چلے جائیں گے وہی پکی ہوتی چلی جائے گی۔ اس لیے اس وقت میں ان چیزوں کا خیال کرنا چاہیے۔ اور یہ بات ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں۔

((مَا أَخْرَجَ الْعِلْمَ عَنْ قُلُوبِ الْعُلَمَاءِ فَإِنَّ الطَّمَعُ))

"تو یہ طمع اور حرص ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ انسان کے دل سے علم کی نورانیت ختم ہو جاتی ہے۔"

خلاصہ بیان

تو یہ چند ایک لفظ جو میں نے آپ کے سامنے بولے ہیں۔ جن کا حاصل ہے کہ

علم پر انسان کو عمل کرنا چاہیے۔ جو مسئلہ علم میں آجائے اس کو اپنانے کی کوشش کرو۔ ظاہری طور پر بھی، باطنی طور پر بھی، ظاہر کا بدلنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایک منٹ میں انسان اپنے آپ کو تبدیل کر سکتا ہے۔ باطن کی تبدیلی مشکل ہوتی ہے۔ اس کے لیے پھر انسان کو زندگی بھر مجاھدے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ وہ بات ایک علیحدہ ہے۔

لیکن اتنا سبق ضرور پختہ ہو جانا چاہیے۔ کہ علم تبھی نورانی علم بنتا ہے۔ انبیاء کا علم بنتا ہے۔ جب اس کے اوپر انسان عمل بھی کرے۔ اگر علم کے مطابق عمل نہ ہو تو وہ علم جہالت ہے۔ علم نہیں۔ اس کے اوپر وہ فضائل نہیں آتے جو علم کے فضائل ہیں۔

اللہ مجھے بھی توفیق دے اور آپ کو بھی توفیق دے کہ اللہ تعالیٰ صحیح علم نصیب فرمائے اور اس علم کے اوپر عمل کرنے کی بھی توفیق دے۔ انہیں الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

وآخِرُ دَعوَانا ان الحمد لله رب العالمين

قصۂ یوسف

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم
بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

(سورہ یوسف :۲۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُاللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

قصۂ یوسف کی اہمیت

گزشتہ بیان میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ذکر تے ہوئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ قول آپ کے سامنے نقل کیا تھا

﴿وَ لَا تَيْئَسُوا مِن رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِن رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْن﴾ (سورہ یوسف آیت ۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کافروں کا کام ہے۔ قرآن کریم میں اور بھی انبیاء کے واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ ایک ہی جگہ مکمل ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ مختلف جگہ ان کے واقعات کے مختلف پہلو نقل کیے گئے۔ یہ واقعہ ایک ایسا ہے جو مکمل ایک ہی جگہ مذکور ہے۔ اور قرآن کریم کے اندر اس کو مختلف ٹکڑوں میں بیان نہیں کیا گیا۔

مکہ معظمہ میں یہ سورت اتری تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سنائی گئی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال پر کہ یا رسول اللہ! ہمیں کوئی اچھا سا قصہ سنائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو احسن القصص کے طور پر ذکر فرمایا۔

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾

اور اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یوسف اور اس کے بھائیوں میں پوچھنے والوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں۔ اور جو میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی ہے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اسی واقعہ سے ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْن﴾ (یوسف آیت ۲۱)

اللہ تعالیٰ جو کرنا چاہیں کرتے ہیں۔ اور ہر طرح سے غلبہ اللہ ہی کو حاصل ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ صرف اس واقعہ کے ظاہر کو دیکھ کر۔ سمجھ اور نتیجہ اخذ کرتے

ہیں۔

تو اس دور میں بھی چونکہ واقعات کے ساتھ بہت مطابقت ہے اس لیے اس دن سے یہ یہی سورت دماغ گھوم رہی ہے۔ اور جی چاہا کہ اس کے بھی بعض پہلو آپ کے سامنے واضح کیے جائیں۔

یوسف علیہ السلام کی زندگی کے مختلف مراحل:

یوسف علیہ السلام اپنے وقت میں حسین ترین تھے۔ ظاہری اور باطنی خوبیوں کے مالک تھے۔ اور آنے والے وقت میں اللہ تعالیٰ انہیں ہی غالب کرنا چاہتا تھا۔ جس کا اشارہ پہلے دے دیا تھا۔ کہ بھائی بھی، والدین بھی، سب سجدہ کرتے ہوئے خواب کے اندر دکھا دیے گئے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پورے خاندان کے اندر برتری حضرت یوسف علیہ السلام کو حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ابھاریں گے، اٹھائیں گے، بلند کر دیں گے، رفعت عطاء کریں گے، اور یہ سارے کے سارے ان کے سامنے جھکیں گے۔ تو خواب میں یہ اشارہ دے دیا گیا تھا۔

لیکن یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو برداشت نہ کیا۔ باپ کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھی۔ وہ برداشت نہ ہوئی، کہ ہمارا باپ اس سے محبت کیوں کرتا ہے۔ اپنے خیال کے مطابق وہ اپنے باپ کو دھوکا دے کر یوسف علیہ السلام کو لے آئے اور اپنے اس پھول جیسے بھائی کو کنویں میں ڈال دیا۔ اپنے طور پر ان کو کنویں میں پھینک کے سمجھے کہ ہم غالب آ گئے۔ اور ہماری مراد پوری ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو کنویں میں بچایا۔ بچانے کے بعد۔ قافلے والوں نے نکالا۔ بھائیوں کو پھر پتہ چل گیا۔ انہوں نے قافلے والوں سے آ کے کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے، گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ اسے بھاگنے کی عادت ہے۔ ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے۔ تم اس کو خریدنا چاہتے ہو۔ تو خرید لو۔ تو تھوڑی سی، بہت گھٹیا درجے کی پونجی لے کے یوسف علیہ السلام کو بیچ دیا۔ اور اپنے خیال کے مطابق اس کو ملک بدر کر دیا۔ کہ وہ قافلہ جدھر

جا رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ادھر ہی اٹھا کے لے گئے ہیں۔ اور یہ اب اس ملک میں واپس نہیں آئے گا۔ جب غلام بنا کے بیچ دیا گیا۔

اور آگے جا کر یوسف علیہ السلام جا کر دوبارہ بک گئے۔ اور عزیز مصر نے خرید لیا۔ عزیز مصر جب اس کو خرید کے گھر لے گئے۔ یہاں تک واقعہ پہنچا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا کہ معاملے پر غالب تو اللہ ہی ہوتا ہے لیکن اکثر لوگوں کو پتہ نہیں۔

دیکھنے والے لوگ تو سمجھتے تھے کہ کنویں میں پھینک دیا۔ اور اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا مصر کے تخت تک۔ تو اگرچہ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کنویں میں پھینکا ہے۔ لیکن اللہ کے علم میں تھا کہ کنویں میں نہیں پھینکا بلکہ مصر کی طرف اس کو روانہ کیا ہے۔ جہاں جا کے اس نے بادشاہت کرنی ہے۔ اور کنویں میں پھینکا جانا۔ یہ سیڑھی کا پہلا زینہ ہے۔ جیسے ہم سیڑھی کے ایک ایک زینے پہ پاؤں رکھتے ہوئے اوپر کو چلے جاتے ہیں۔ تو بظاہر دیکھنے میں تو کنویں میں پھینکا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے بادشاہت تک پہنچنے کا یہ پہلا زینہ تھا۔ پھینکنے والوں نے نیچے کو پھینکا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نیچے کو نہیں۔ بلکہ اوپر کو جا رہا ہے۔ تو ظاہر کچھ ہے اور اس کا باطن کچھ ہے۔

غلام بنا کے بیچ دیا گیا۔ بک گئے۔ آگے چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ترقی کے درجات کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس رکوع میں جس کے اندر بکنے کا ذکر آیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے ایک کمال کو بہت ہی اچھے انداز میں بیان فرمایا جس میں یہ سبق موجود ہے۔ کہ بلند کردار اور اخلاق کی مضبوطی اس کے ساتھ انسان کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور جو بھی اس پر مصیبت آئے۔ اور وہ اپنے اسی اونچے اخلاق کے ساتھ اور بلند کردار کے ساتھ اس کو برداشت کرتا چلا جائے۔

تو ان سختیوں کے پردے سے پھر آگے اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا فرماتے ہیں۔ اور پھر انسان کو عروج نصیب ہوتا ہے۔

عزیز مصر کے گھر:

یہ پہلو ہم سب کیلئے ہر وقت آنکھوں کے سامنے رکھنے کا ہے۔ واقعہ تو آپ نے سنا ہوا ہی ہے۔ کہ عزیز مصر یوسف علیہ السلام کو اپنے گھر لے گئے گھر جا کے خادم بنا دیا اور اپنی بیوی سے کہہ دیا۔ بیوی کا نام بعض روایات میں ''زُلَیخَا یا زَلِیخَا'' دونوں طرح سے اس کو پڑھا گیا ہے۔ عام طور پر مشہور زُلَیخَا ہے عزیز مصر یوں سمجھو کہ جس طرح آپ آج کل کی اصطلاح میں کہہ لیں۔ وزیر اعظم۔ یہ بادشاہ نہیں تھا، وزیر اعظم تھا۔ جیسے تفسیروں میں لفظ آتا ہے۔

﴿مَدَارُ الْمَهَامّ﴾

بڑے بڑے کاموں کا دارومدار اس پہ ہوتا تھا۔ جس طرح آج صدر تو ویسے ہی ہوتا ہے۔ لیکن کام سارے کے سارے وزیر اعظم کرتا ہے۔ اسی طرح اس وقت بھی بادشاہ کوئی اور تھا۔ مفسرین نے ریان بن ولید بادشاہ کا نام لکھا ہے۔ اور عزیز مصر اس کا مدار المہام تھا۔ جس کو ہم وزیر اعظم کہہ لیں۔ سارے کے سارے کام اسی کے ہاتھ میں ہوتے تھے، کاروبار سارا یہی چلاتا تھا۔

بہر حال مصر کی ذمہ دار شخصیت تھی۔ سلطنت کا سارا کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ تو اللہ نے یوسف علیہ السلام کو اس گھر میں پہنچا دیا۔ اور اس پہنچانے کو اللہ کہتا ہے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو ٹھکانہ دے دیا۔ تو ایک ٹھکانے پہ یوسف علیہ السلام کو پہنچا دیا۔ وہاں پھر اللہ نے ان کی تربیت کی۔ تاویل احادیث، باتوں کو ٹھکانے لگا دینا۔ یعنی خوابوں کی تعبیر وہاں رہتے ہوئے یوسف علیہ السلام کو یہ ساری چیزیں حاصل ہوئیں۔

یوسف علیہ السلام پر ایک عظیم امتحان:

لیکن ساتھ ساتھ ایک امتحان بھی آ گیا۔ وہ امتحان یہ آیا کہ یوسف علیہ السلام جوانی کو پہنچ گئے۔ بے مثال شخصیت تھی۔ بے مثال حسن تھا۔ نوجوان بھی ہو گئے۔ حسن بھی نمایاں ہو گیا۔ عزیز مصر کی بیوی مشرک تھی۔ مصر کے رہنے والے لوگ مشرک تھے۔ بت

پرست تھے۔ آخرت کی قائل نہیں تھی۔ آخر وہ یوسف علیہ السلام کو دل دے بیٹھی۔ یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہوگئی۔ عاشق ہوگئی۔ ان کی محبت میں مبتلا ہوگئی۔

اب یہ گھر میں خادم ہیں اور زرخرید غلام ہیں، جو ہر طرح سے اپنے تابع ہوتا ہے۔ نوکر اور ملازم نہیں کہ چھوڑ کے بھاگ جائے۔ زرخرید غلام ہیں۔ ہر وقت گھر میں ہیں۔ ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں، جو خدمت وہ کہے کرتے ہیں۔ تو جب یوسف علیہ السلام کے ساتھ محبت ہوگئی۔ تو اس نے یوسف علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی۔ جس طرح سے زلیخا جوان تھی۔ یوسف بھی جوان تھے۔ لیکن دونوں میں فرق کیا تھا؟

زلیخا مشرکہ تھی۔ آخرت کی قائل نہیں تھی۔ بت پرست تھی۔ اور یوسف علیہ السلام نبی کے خاندان سے تھے۔ نبی کے بیٹے تھے۔ نبی کے پوتے تھے۔ نبی کے پڑپوتے تھے۔

❀ باپ یعقوب علیہ السلام.............وہ بھی نبی۔

❀ دادا اسحاق علیہ السلام................وہ بھی نبی۔

❀ پردادا ابراہیم علیہ السلام.............وہ بھی نبی۔

اور یہ خود بھی آنے والے وقت میں نبی بننے والے تھے۔ آخرت کے قائل تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حاضر ناظر ہونے کے قائل تھے۔ یہ ساری چیزیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے تھیں۔ جس طرح سے ہم سب آخرت کے قائل ہیں۔ اللہ کے حاضر ناظر ہونے کے قائل ہیں۔ اور ہر چیز کو مانتے ہیں۔

تو جو شخص اللہ کا قائل ہے۔ اللہ کے حاضر ناظر ہونے کا قائل ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ آخرت میں جا کے حساب دینا ہے۔ تو یہ علم اگر مستحضر ہے تو پھر انسان برائی کے اندر مبتلا نہیں ہوا کرتا ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ لیکن انبیاء غافل نہیں ہوتے۔ ان کے سامنے ہر وقت اس چیز کا استحضار ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں جس طرح سے اشارہ موجود ہے۔

﴿غَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ﴾

ایک دن زلیخا نے موقع پا کر۔ دروازے بند کر لیے۔ اس بارے میں عام طور پر واعظوں سے آپ نے سنا ہوگا۔ کہ سات کمرے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے۔ اور یوسف علیہ السلام کو سب سے آخری کمرے میں لے گئی۔ اور لے جانے کے بعد سارے دروازے اس نے بند کر دیے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ یہ ایک تعبیر ہے۔ چونکہ ابواب جمع کا لفظ آیا ہے۔ (یہ ایک طالب علمانہ بات ہے) یعنی بہت سارے دروازے بند کر لیے۔ تو اس کی ایک تعبیر ہے۔ کہ شاید وہ آگے پیچھے کئی سارے کمرے تھے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ بسا اوقات ایک ہی کمرہ ہو۔ اس کے بھی کئی دروازے ہوتے ہیں۔ جس طرح سے آپ نے کوٹھیاں بنی ہوئی دیکھی ہوں گی۔ اب یہ دیکھو یہ ہمارا ایک ہی کمرہ ہے۔ اور اس کے کتنے دروازے ہیں؟

بہر حال اس کمرے کے جتنے دروازے، جتنی کھڑکیاں تھیں وہ سارے کے سارے بند کر لیے۔ بند کرنے کے بعد صریح الفاظ میں حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی۔

"هَيْتَ لَكَ"

میں تجھے کہتی ہوں، متوجہ ہوں۔ تو یوسف کو خطاب کر کے کہا کہ آ جا۔ اس طرح گناہ کی دعوت دی۔

اب زلیخا تو سمجھتی تھی کہ دروازے بند کر لیے کوئی دیکھنے والا نہیں۔ لیکن یوسف تو ایسا نہیں تھا کہ وہ سمجھتا ہو۔ کہ مجھے کوئی دیکھنے والا نہیں۔ جس وقت اس نے یہ دعوت دی۔ تو یوسف علیہ السلام نے آگے سے کہا۔

"مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ"(سورہ یوسف آیت ۲۳)

یہ تھا یوسف علیہ السلام کا قول۔ اور حالات ایسے ہو گئے تھے۔ کہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر اللہ کی برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے نہ ہوتی۔ تو یوسف بھی پھسل جاتے۔ لیکن اللہ کی برہان تھی۔ جس نے یوسف علیہ السلام کو سنبھال لیا۔

برھان کیا تھی؟:

یوسف علیہ السلام نے وہ اللہ کی برھان کیا دیکھی تھی؟ جس کی بناء پر یوسف علیہ السلام سنبھل گئے۔ تفسیروں کے اندر مختلف واقعات لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں ان واقعات میں سے کوئی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن تفسیروں میں اسرائیل روایات ہیں۔

کوئی کہتا ہے۔ کہ اس کمرے کے اندر زلیخا کا بت پڑا تھا۔ اور اس نے اس کے اوپر کپڑا دیا۔ تو یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہی ہے؟۔ وہ کہتی ہے کہ یہ میرا معبود ہے۔ میں اس کی عبادت کرتی ہوں۔ چونکہ میں اس کے سامنے یہ کام نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں نے اس کو چھپایا ہے۔ تو یوسف علیہ السلام کو فوراً خیال آیا۔ اس نے تو اپنے رب کو کپڑا ڈال کر چھپا دیا۔ اور اس کا خیال ہے کہ اب یہ دیکھے گا نہیں۔ لیکن میرے رب پر تو کپڑا ڈال کر نہیں چھپایا جا سکتا۔ کہ میں کہوں کہ وہ نہیں دیکھ رہا۔ فوراً سنبھل گئے۔ کہ اگر اس کو اپنے رب سے حیاء آتی ہے تو مجھے بھی حیاء آنی چاہیے۔ رب کو چھپا دیا۔ لیکن میں کیسے چھپاؤں۔ تو یہ خیال سامنے آ گیا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسی وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت متحضر ہو گئی۔ ایسے لگا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سامنے متشکل ہو کر آ گئے اور کہہ رہے ہیں۔

"تَعْمَلُ عَمَلَ الْفُجَّارِ وَاَنْتَ مَكْتُوبٌ فِي الْاَنْبِيَاءِ"

کیا تو نادانوں جیسی حرکتیں کرے گا؟ تیرا نام تو نبیوں میں لکھا ہوا ہے۔

(تفسیر طبری ۱۶/۴۵)

اس پر حضرت یوسف علیہ السلام متنبہ ہو گئے۔ استحضار ہو گیا۔ کہ یہ کام میری شان کے لائق نہیں ہے۔ یہ واقعی تفسیروں میں ہے، اسرائیلی روایات میں ہے۔

ان باتوں کی طرف اگر نہ بھی جائیں۔ تو وہ برھان جو حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے آئی ہے۔ جس نے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ وہ یہی ہے کہ یوسف علیہ السلام کو فوراً اس بات کا استحضار ہو گیا۔ کہ

"اِنَّه رَبِّیٓ اَحسَنَ مَثوَایَ" (سورہ یوسف آیت ۲۳)

زلیخا کو کہتے ہیں۔ کہ تیرا شوہر میرا مالک ہے۔ "رَبّی" سے مراد عزیز مصر ہے۔ اور اس نے مجھے کتنا اچھا ٹھکانہ دیا ہے۔ میرے لیے کتنا آرام کا بندوبست کیا۔ تو کیا میں کوئی ایسا ناشکرا ہوں۔ کہ میں اس کے گھر میں خیانت کروں۔ اب

- وہ تو مجھے اچھا کھانے کو دے۔
- وہ تو مجھے اچھا پہننے کو دے
- وہ تو میرے لیے ہر طرح سے راحت کے اسباب مہیا کرے۔
- وہ تو مجھے بیٹا بنا رکھے۔ (جیسے قرآن میں اشارہ موجود ہے)

"اَکرِمِی مَثوَاهُ عَسٰی اَن یَّنفَعَنَا" (سورہ یوسف آیت ۲۱)

اس کی عزت کرنا۔ اس کو اچھی طرح سے رکھنا۔ امید ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا۔

"اَو نَتَّخِذَہ وَلَدًا"

یا ہم اس کو اپنی اولاد ہی بنالیں گے۔ بیٹا ہی بنالیں گے۔

تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے تو وہ رکھے بیٹوں کی طرح رکھے۔ میرے متعلق اچھی امید رکھے۔ مجھے اچھا کھانے کو دے اچھا پہننے کو دے۔ تو میں اگر ناشکری کروں اور اس کے گھر میں ہی خیانت کروں۔ تو مجھ سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ اور ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتے۔

یہ بات جو حضرت یوسف علیہ السلام کے استحضار میں آئی۔ اس نے ان کو اللہ کی نافرمانی کی طرف جانے نہیں دیا۔ یعنی محسن کے احسان کی قدر دانی۔ کہ جس گھر میں میں کھاتا ہوں۔ اس گھر میں خیانت کیسے کروں؟۔ اس میں کتنا بڑا سبق ہے۔ کہ اس بات نے حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار میں کتنا اثر ڈالا۔ کہ اپنے محسن کے گھر کے اندر اس قسم کی خیانت کرنا۔ یہ پرلے درجے کا ظلم ہے۔ اور ظالم آدمی کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔

اسباب گناہ کے باوجود بچ جانا اصل کمال ہے:

اب آپ غور فرمائیں۔

- دعوت دینے والی عورت ہے..........عورت بھی معمولی نہیں۔
- گھر میں موجود ہیں..........کوئی دیکھنے والا نہیں۔
- داعی خود عورت ہے..........ہر قسم کے اسباب مہیا ہیں۔
- گناہ کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

اتنی باتیں ہونے کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام سنبھل گئے۔ اس لیے کہ ان کو خیال آیا کہ محسن کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔ محسن کے گھر میں خیانت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ خیال اتنا غالب آیا کہ شیطان کا جتنا تانا بانا تھا سب کافور ہو گیا۔

تو یوسف علیہ السلام وہاں سے چھوٹ کر بھاگے۔ زلیخا نے زبردستی پکڑنے کی کوشش کی۔ پیچھے سے دامن ہاتھ میں آگیا۔ اور کھینچنے کی وجہ سے پھٹ گیا۔ اور جب یوسف علیہ السلام نے دروازہ کھولا۔ پیچھے سے زلیخا نے پکڑا ہوا تھا۔ کھینچ رہی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی اتفاق ایسا ہوا کہ وہی وقت عزیز مصر کے گھر آنے کا تھا۔ جیسے باہر سے ایک آدمی آتا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے لگتا ہے۔ کہ دروازہ کھولو۔ اور اچانک دروازہ کھل جائے۔ تو فوراً آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ اب صورت حال وہ پیدا ہو گئی۔

جو پہلو ہمارے لیے زیادہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہی ہے کہ گناہ کے ہر قسم کے اسباب مہیا ہو جانے کے باوجود جو شخص گناہ سے بچتا ہے۔ اور اس خیال سے بچتا ہے کہ میرے لیے اللہ کی نافرمانی ٹھیک نہیں۔ اللہ کے میرے پہ ہی احسانات ہیں۔ میں اللہ کا قائل ہوں۔ آخرت کا قائل ہوں۔ مجھے محاسبے کا خیال ہے۔ ایسے انداز میں جو شخص گناہ سے بچتا ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ بہت زیادہ محبوب شخصیت ہوتی ہے۔

جوانی کی عبادت:

حدیث شریف میں ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا۔

"سبعۃٌ یظلّھم اللّٰہُ فِی ظِلّہ یومَ لَا ظِلَّ اِلاّ ظِلُّہٗ"

سات قسم کے انسان ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا۔ جس دن کہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں گا۔ (مشکوۃ ۱/۶۸۔ بخاری۔ ۱/۹۱)

ان سات میں ایک یہ بھی ہے۔

"شَابٌ نَشَأَ فِی عِبَادَۃِ اللّٰہِ"

وہ جوان جو اللہ کی عبادت میں پرورش پاتا ہے۔ جو جوانی کے زمانے میں اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ آپ کے یاد رکھنے کی بات ہے۔

کہتے ہیں نا کہ ؎

در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم مے شود پرہیزگار

پیغمبرانہ سنت تو یہ ہے کہ انسان جوانی کی عمر میں توبہ کرے اور گناہوں سے بچے۔ جس وقت بھیڑیا بوڑھا ہو جائے۔ اور اس کے منہ میں دانت نہ رہیں تو وہ بھی پرہیزگار ہو جاتا ہے۔ اور کسی کو نہیں چیرتا۔ کسی کو نہیں پھاڑتا۔ جب منہ میں دانت ہی نہیں ہیں۔ وہ کیا پھاڑے گا؟

اسی طرح سے شیخ سعدی اسی بات کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں۔

"جوانِ سخت پے باید کہ از شہوت پرہیزد
کہ پیر ست رغبت را خود آلت برنے خیزد"

جو جوان مضبوط قسم کا ہے۔ اس کو چاہیے کہ شہوت سے پرہیز کرے۔ ورنہ بڈھا ہو کر پرہیز نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا؟ کیونکہ اس کا تو آلہ ہی حرکت نہیں کرتا۔ (گلستان ص ۲۴۴)

تو اصل تو خوبی یہ ہے کہ جوانی کے زمانے میں پرہیز کرے۔ تو عبادت جوانی کے زمانے میں یہ پیغمبرانہ سنت ہے۔ اس وقت جو انسان توبہ اور استغفار کرتا ہے۔ یہ اللہ

تعالیٰ کے نزدیک بہت قابل قدر ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو اپنے خصوصی سائے میں جگہ دے گا۔ جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

کیونکہ گناہ کے اسباب جوان کو حاصل ہوتے ہیں۔ جب جوانی میں وہ بچے گا تو اللہ کے ہاں بہت قدر پائے گا۔

یہ بات تو میں نے آپ کے مطلب کی کہی۔ کہ جوانی کی قدر کرو۔ جوانی کے وقت کی عبادت، جوانی کے وقت کی نیکی اللہ کے ہاں بہت قدر رکھتی ہے۔ بوڑھا ہو کے جب آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ تو تسبیح ہاتھ میں لے کے مسجد میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ بات نہیں ہوتی جو جوانی میں ہوتی ہے۔

اسباب کے باوجود گناہ سے بچنے کی فضیلت:

لیکن جو بات میں آپ کے سامنے اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ان سات میں سے ایک یہ بھی ہے۔

"رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَ جَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ"

ایک وہ آدمی جس کو کوئی عورت گناہ کی دعوت دیتی ہے۔ اور ہے بھی خوبصورت عورت۔ یہ بھی نہیں کہ بدصورت ہے۔ اسکی بدصورتی کی بناء پر انسان متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اچھے خاندان کی، اچھی صفات کی مالک ہے۔ ورنہ اگر اچھے خاندان کی نہیں۔ مثلاً بھنگن ہے۔ ، خاکروبن ہے، اس قسم کے گھٹیا خاندان کی ہو تو انسان بسا اوقات اس وجہ سے نفرت کرتا ہے۔ کہ یہ گھٹیا خاندان کی ہے۔ تو ایسی بات بھی نہیں بلکہ وہ خوبصورت ہے۔ اچھے خاندان کی ہے۔ اچھی صفات کی ہے۔ خود دعوت دے رہی ہے۔ پھر بھی وہ کہتا ہے۔ مجھے اللہ کا ڈر ہے۔

تو اسباب مہیا ہونے کے باوجود گناہ نہ کرنا۔ اور اللہ کے خوف سے اس گناہ کو چھوڑ دینا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی پیاری اداء ہے کہ ایسے شخص کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔ جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

خلوت میں ذکرِ الٰہی کی فضیلت:

اور انہیں میں ایک یہ بھی ہے۔

"رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ"

ایک آدمی تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے۔ اور اللہ کے خوف سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

مجمع کے اندر لوگوں کو دکھانے کیلئے مگر مچھ کی طرح آنسو بہا دینا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں اس آنسو کی قدر ہے جو خلوت میں انسان کی آنکھ سے نکلے۔ تو خلوت میں اللہ کو یاد کر کے روئے۔ چاہے محبت کی بناء پر، چاہے خوف کی بناء پر۔

رونا محبت میں بھی ہوتا ہے۔ آپ اپنے کسی محبوب ترین دوست کو یاد کرتے ہوئے روتے ہیں۔ تو رونا محبت میں بھی ہوتا ہے۔ اور رونا خوف سے بھی ہوتا ہے۔ تو اللہ کی محبت میں روؤ۔ یا اللہ کے خوف سے روؤ، وہ ایک ایک آنسو ایسا پیارا ہے اور اللہ کے نزدیک اس کی اتنی قدر ہے۔ کہ اس کو بھی اللہ اپنے سائے میں جگہ دے گا۔ جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہو گا۔ تو یہ ہے۔ سنتِ یوسفی۔ کہ گناہوں کے اسباب مہیا ہو جانے کے باوجود گناہ نہ کرنا۔

حدیثِ غار:

یہ کتنا مقبول ہے۔ اس کی مثال سرور کائنات ﷺ نے ایک اور حدیث میں بیان فرمائی۔ اور وہ معروف حدیث ہے۔ آپ نے سنی ہوئی ہو گی۔ جس کو حدیثِ غار کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔

کہ تین آدمی سفر کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ بارش شروع ہو گئی۔ اور وہ بارش سے بچنے کیلئے ایک غار میں گھس گئے۔ لیکن بارش جب زوردار ہوئی۔ تو اوپر سے بارش کے زور سے ایک پتھر لڑھکتا ہوا نیچے کو آیا۔ اور غار کے منہ پہ آ کے اٹک گیا۔ اور وہ پتھر اتنا وزنی تھا۔ کہ اگر وہ اندر سے تینوں زور لگائیں تو بھی ذرہ برابر نہیں ہلتا تھا۔

اب پتھر کے زور سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ تو اب وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ کہ اللہ کے سامنے کوئی اس قسم کا اپنا عمل پیش کرو۔ جو تم نے اللہ کی رضاء کیلئے کیا ہو۔ اور اس کا وسیلہ دے کے اللہ سے دعا مانگو۔ کہ اے اللہ! اس مصیبت کو ٹال دے۔

تو تین آدمی تھے۔ تینوں نے اپنا ایک ایک عمل پیش کیا۔ اور اللہ سے دعا کی۔ کہ یا اللہ! اگر میرا یہ عمل تیرے ہاں قبول ہے تو تو ہم سے یہ مصیبت ٹال دے۔

ان میں سے پہلے شخص نے وسیلے کے طور پر جو عمل پیش کیا وہ والدین کی خدمت ہے۔ کہ یا اللہ! میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اور جب میں واپس آتا تھا تو بکریوں کا دودھ نکالتا۔ سب سے پہلے میں اپنے والدین کو پلاتا تھا۔ اپنے بچوں کو بعد میں پلاتا تھا۔ ایک دن میں بکریاں چرانے کے لیے دور چلا گیا۔ جب واپس آیا تو والدین سو چکے تھے۔ میں نے حسب معمول دودھ نکالا۔ اور دودھ کا پیالہ لے کے ان کے سرہانے کھڑا رہ گیا۔ اور میں نے ان کو جگایا نہیں۔ تا کہ ان کی نیند خراب نہ ہو۔ اور دوسری طرف بچے بھوکے، بلکتے رہے۔ میں نے کہا نہیں پہلے والدین کو پلاؤں گا۔ تمہیں بعد میں پلاؤں گا۔ تو ساری رات وہ سوئے رہے۔ اور میں پیالہ لے کے کھڑا رہا۔ کہ یہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پلاؤں۔ اور یہ میں نے تیری رضا کیلئے کیا تھا۔ یا اللہ! اگر میرا یہ عمل تیرے ہاں قبول ہے۔ تو اس عمل کے وسیلے سے ہم سے یہ مصیبت ٹال دے۔ جب یہ دعا کی۔ تو پتھر تھوڑا سا لڑھک گیا۔ جس کی وجہ سے غار کا کچھ حصہ کھل گیا۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ اس کا یہ عمل اللہ کے ہاں قبول تھا۔ تو والدین کی خدمت اتنا عظیم عمل ہے۔ اولاد کے مقابلے میں والدین کو ترجیح دینا۔ والدین کی پہلے خدمت کرنا۔ اولاد کی بعد میں خدمت کرنا۔ اتنا بڑا مقبول عمل ہے۔ کہ جب اس کے وسیلے کے ساتھ دعا کی گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے مصیبت ٹال دی۔

دوسرے شخص نے کہا کہ یا اللہ! میں نے ایک مزدور رکھا تھا، اس کو مزدوری میں چند سیر چاول دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جب وہ کام سے فارغ ہوا اور میں نے اس کو متعین

کی ہوئی مزدوری پیش کی۔ تو جیسے مزدوروں کی عادت ہوتی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ یہ تو تھوڑی ہے۔ میں تو اور لوں گا۔ اور ناراض ہو کر چھوڑ کے چلا گیا۔ تو میں نے اس کے وہ چاول بوئے۔ فصل پیدا ہوئی۔ وہ بیچی۔ اس طرح سے میں نے اس کو بڑھایا۔ پھر میں نے اس سے کچھ گائیاں خرید لیں۔ اور ان کے چرانے کیلئے غلام خرید لیا۔ کافی مدت کے بعد وہ آیا۔ اور آ کے کہتا ہے۔ اللہ سے ڈر۔ میرے چاول تیرے ذمے ہیں وہ دے۔ تو میں نے کہا کہ یہ سارے جانور لے جا۔ چرانے والے کو بھی لے جا۔ یہ تیرے ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ میرے سے مذاق نہ کر۔ وہ تو چند سیر چاول تھے، میں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے سارا قصہ سنایا۔ تو یا اللہ! یہ سب کچھ میں نے تیری رضا کیلئے کیا تھا۔ اگر میرا یہ عمل تیرے ہاں قبول ہے تو اس کی برکت سے۔ اس کے وسیلے سے ہم سے یہ مصیبت ٹال دے۔ تو چٹان تھوڑی سی اور کھسک گئی۔

تیسرے نے جو چیز پیش کی۔ وہ ہے اس واقعہ کے مناسب۔ تیسرا شخص کہنے لگا۔ کہ یا اللہ! مجھے اپنے چچا کی بیٹی سے محبت ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس سے معصیت کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ سو دینار لوں گی۔ تو میں نے سو دینار کمائے۔ کمانے کے بعد میں نے اس کو دیے۔ اور پھر جس وقت اس نے مجھے اپنے پر قدرت دی۔ عین اس وقت اس کے منہ سے نکلا۔ جب میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تو اس کے منہ سے نکلا کہ اللہ سے ڈر۔ اور بغیر حق کے اس چیز کو استعمال نہ کر۔ کہتا ہے۔ میں تیرا نام سن کے ڈر گیا۔ اور میں نے وہ سو دینار بھی چھوڑا۔ اور اس معصیت سے بھی باز آیا۔ اور یہ سب کچھ تیرے ڈر سے کیا تھا۔ اے اللہ! اگر میرا یہ عمل تیرے ہاں قبول ہے۔ تو تو ہم سے یہ مصیبت ٹال دے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ کہ غار کا سارا منہ کھل گیا۔

تو یہ آپ کو اس بات کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ کہ گناہ کے اسباب مہیا نہ ہوں۔ پھر انسان گناہ نہ کرے۔ اس میں زیادہ خوبی کی بات نہیں ہے۔ ویسے یہ بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یہ بات یاد رکھو۔ اور اللہ سے دعا کرو۔ کہ اللہ گناہ کا کوئی سبب بھی نہ

دے۔ پھر تو آپ بچ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیونکہ آزمائش میں پڑنے کے بعد پھر ثابت قدم رہ جانا ہر کسی کا کام نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ ہمیں اس قسم کے اسباب ہی نہ دے۔

یوسفی کردار کیا ہے؟

لیکن اصل کمال یہ ہے کہ گناہ کے اسباب موجود ہوں۔ گناہ کی طرف دعوت دینے والی چیز موجود ہو۔ پھر انسان گناہ نہ کرے۔ اصل کمال یہ ہے۔ اور یہ کمال حضرت یوسف علیہ السلام نے دکھایا۔ اور پھر ایسے ثابت قدم ہوئے۔ کہ پھر بعد میں جتنی مصر کی عورتیں۔ زلیخا کی سہیلیاں تھیں۔ وہ سب اکٹھی ہوئیں (سارا واقعہ تفصیل سے عرض کرنے کی ضرورت نہیں)۔ جو سبق کی بات تھی۔ وہ یہ ہے۔ کہ پھر سب نے مل کر گناہ کی دعوت دی۔ اور زلیخا نے دھمکی دی۔ کہ اگر میرا کہنا نہ مانا تو میں جیل میں بھجوا دوں گی۔ آخر وہ وزیراعظم کی بیوی تھی۔ وہ اس قسم کے اختیارات رکھتی تھی۔ وزیراعظم بھی اس کے تابع تھا۔

تو یوسف علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی۔ کہ یا اللہ! جیل مجھے پسند ہے۔ اس کام کے مقابلے میں جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں۔ معصیت اختیار نہیں کی۔ مصیبت اختیار کرلی۔ یہ ہیں وہ عادتیں جن کی بناء پر پھر اللہ نے ان کو بلندی عطا فرمائی۔ باوجود اسباب مہیا ہونے کے گناہ نہ کرنا۔ اور پھر اگر گناہ پر کوئی دوسرا مجبور کرے۔ اور یہ کہے کہ ہماری بات مان لو ورنہ تم پہ یہ مصیبت آجائے گی۔ تو مصیبت کو لے لینا، گناہ نہ کرنا۔ یہ اصل کے اعتبار سے سنتِ انبیاء ہے۔ یہ یوسفی کردار ہے۔ جس کے نتیجے میں پھر انسان کو بلندی ملتی ہے۔

یہ ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے وہ اسباق جو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ضمن میں ہمیں دیے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیے تھے۔ کہ مصیبتیں سہ لینا مگر اللہ کی نافرمانی نہ کرنا۔ اسباب مہیا ہوجانے کے باوجود گناہ نہ کرنا۔ معصیت اور مصیبت کے

درمیان مقابلہ آجائے تو مصیبت کو اختیار کر لینا۔

- تباہ ہونا برداشت کرلو۔
- مرنا برداشت کرلو۔
- جیل میں جانا برداشت کرلو۔
- ہتھ کڑیاں برداشت کرلو۔
- سزائیں برداشت کرلو۔
- مصیبتیں برداشت کرلو۔
- تکلیفیں برداشت کرلو۔
- تختہ دار قبول کرلو۔

لیکن اللہ کی نافرمانی والا کام نہ کرو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے اندر یہ بھی ایک بہت بڑا سبق ہے۔

پھر اس کے بعد زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھجوایا۔ اور جیل میں جانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے جس کردار کا مظاہرہ کیا۔ اور اس کے بعد پھر بادشاہ تک آپ کی ملاقات ہوئی۔ یہ حصہ انشاء اللہ العزیز پھر ذکر کریں گے۔ آج اتنا ہی کافی۔

قصہ یوسف میں اسباق:

سبق اس میں یہی ہے

(۱) کہ ایک تو اپنے محسن کا احسان یاد رکھو۔ کبھی محسن کی نافرمانی نہ کرو۔ جو آپ پر احسان کرتا ہے۔ اس کے فرمانبردار بن کے رہو

(۲) اور گناہ کے اسباب مہیا ہو جانے کے باوجود گناہ سے بچنا بہت کمال کی بات ہے۔

(۳) اسی طرح مصیبت اور معصیت کا مقابلہ آجائے کہ یا مصیبت لو یا گناہ

کرو۔تو مصیبت برداشت کرلو۔گناہ کی طرف رغبت نہ کرو۔یہ بھی یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ایک بہت بڑا سبق ہے۔

(۴)اور ایسے موقع پر گناہ سے بچ جانا جبکہ گناہ کی کشش کے پورے اسباب موجود ہوں۔کوئی رکاوٹ نہ ہو۔سوائے خدا کے خوف کے۔یہ عمل اللہ کے نزدیک بہت مقبول ہے۔اور اتنا مقبول ہے۔کہ اگر اس کے وسیلے سے دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرماتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے اس حصے میں یہ چند ایک سنہری اصول نکلتے ہیں۔جو میں نے آپ کے سامنے ذکر کیے ہیں۔تو ان کو یاد رکھیے۔اور ان کو اپنانے کی کوشش کیجیے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو بھی، مجھے بھی، دنیا اور آخرت میں عزت سے نوازے

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین۔

عظمتِ مدارس

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: تقریب اختتام تعلیمی سال

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ ((فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْم)) (بخاری.۲/۹۷۷.مشکوۃ.۱/۳۸)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذَالِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُاللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

مدارس کا ہم پر احسان:

آج تعلیمی سال کا اختتام ہے۔شوال میں افتتاح تھا۔اور آج رجب میں اختتام ہے۔اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جیسے اس نے اپنی توفیق کے ساتھ اچھے حالات میں افتتاح کروایا تھا۔تو آج اسی کی توفیق کے ساتھ ہم اچھے حالات میں سال کے اختتام کو پہنچ رہے ہیں۔

سال جو ہمارا یہاں گذرا ہے۔آخر میں جا کے ایک نظر ڈالنی پڑتی ہے، سال کے حالات پر، اور اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

طلبہ کو بھی چاہیے کہ ان حالات کا جائزہ لیں جو سال بھر گذرے۔اور اساتذہ کو بھی چاہیے۔باب العلوم کی چار دیواری میں ہم لوگوں نے جو وقت گذارا ہے۔اللہ کے کرم کے ساتھ .... جامعہ کی برکت سے .... ہمیں یہاں کھانے کو ملا ...... پینے کو ملا .... رہنے کو جگہ ملی ......راحت وآرام کے اسباب اللہ تعالیٰ نے اتنے مہیا فرمائے کہ واقعہ یہ ہے۔(آپ حضرات کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جب ہم پڑھا کرتے تھے۔تو باوجود اس کے کہ اس وقت مدارس میں

- نہ بجلی ہوتی تھی۔
- نہ پنکھے ہوتے تھے۔
- نہ مطبخ کا اتنا وسیع انتظام تھا۔
- نہ رہنے سہنے کی اتنی سہولت تھی۔
- پاکستان کی ابتداء ابتداء تھی۔
- بہت غربت کا زمانہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود ہمارا تاثر یہ ہوتا تھا۔ کہ گھر کے مقابلے میں ہم مدرسے میں راحت میں ہیں۔ یہ واقعہ ہے۔اور اگر آپ بھی انصاف کے ساتھ جائزہ لیں گے تو

ایسا ہی ہوگا۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ گھر میں ہمیں پتہ ہے۔ایک وقت آپ آتے ہیں اور اماں سے کھانے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ کہتی ہے سالن تو ہے نہیں، اچار لے لو۔سالن تو نہیں ہے، چٹنی لے لو۔دیہاتوں میں رواج ہے۔۔آپ آکے بھوک کا اظہار کریں گے۔وہ کہیں گے کہ ابھی روٹی تو تیار نہیں ہے۔یہ بھنے ہوئے دانے چبالو۔دیہات میں پاپے اور ڈبل روٹیاں تو نہیں چلتیں۔ بھنے ہوئے دانے کھالیے، چھلی کھالی، مکی کا بھٹہ کھالیا۔ایک وقت سالن پکتا ہے،دووقت کھاتے ہیں۔کسی وقت پکتا ہے،کسی وقت نہیں ہوتا۔چٹنی کے ساتھ بھی کھانی پڑ جاتی ہے،اچار کے ساتھ بھی کھانی پڑ جاتی ہے۔وقت بے وقت بھی کھانا ہو جاتا ہے۔

عوام الناس کی مشقتیں:

جب آپ گھر ہوتے ہیں۔تو کاشتکاروں کے گھر میں کبھی آپ کو بیل،بھینس بھی سنبھالنے پڑ جاتے ہیں۔اورآپ کھیتوں میں جاتے ہیں تو کبھی رنبہ، درانتی بھی آپ کو استعمال کرنی پڑ جاتی ہے۔سارا دن مٹی سے کھیلنا بھی پڑ جاتا ہے۔جو بھی جس کا گھر میں پیشہ ہے۔وہ لازماً گھر والے بچوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔

- باہر سے کوئی چارہ کاٹ کے لائے گا۔
- کوئی کاٹے گا اور جانوروں کو ڈالے گا۔
- کوئی جانوروں کو پانی پلائے گا۔

مزدور قسم کے جو لوگ ہوا کرتے ہیں۔وہ اپنے بچوں کو مزدوری پہ لگا دیتے ہیں۔ سفر میں جاتے ہوئے آپ حضرات بھی دیکھتے ہیں، میں بھی دیکھتا ہوں۔

- سڑکیں بنا رہے ہوتے ہیں۔
- پتھر کوٹ رہے ہوتے ہیں۔
- سڑکوں سے پتھرا کھیڑ رہے ہوتے ہیں۔

- لک بچھا رہے ہوتے ہیں۔
- بجری ڈال رہے ہوتے ہیں۔

کبھی ان کے بدن کا حال، انکے کپڑوں کا حال، آپ نے دیکھا ہے؟ چلتے پھرتے کبھی نظر ڈالی ہے۔؟ کس حال میں ہوتے ہیں؟۔ سارا دن کام کرتے ہیں۔ نہ کپڑوں کا کوئی حال، نہ بدن کا کوئی حال۔ اور جب فارغ ہو کے شام کو گھر جاتے ہیں۔ تو معلوم نہیں روٹی کیا ملتی ہے؟۔ کیا نہیں ملتی؟۔

کل ہی ہم فقیر شاہ (میلسی) کی طرف گئے تھے۔ تو حقیقت ہے۔ میں تو یہی نظر ڈالتا آیا ہوں۔ کہ لوگ جو کپاس میں کام کر رہے تھے۔ کسی کے بدن پہ قمیض نہیں تھی۔ اور ہاتھ میں کھرپہ یا درانتی۔ اور دھوپ کی وجہ سے کالا سیاہ رنگ اور مٹی کے ساتھ اٹے ہوئے۔ یا صبح وشام جو سپرے کرتے ہیں، یہ تو ایسے ہے گویا زہر پھانکتے ہیں۔ اور بعضے بعضے لوگ اس سے مر بھی جاتے ہیں۔ کاشتکاروں کا حال اس گرمی میں آپ نے دیکھا۔! جب یہ کپاس میں سے گھاس وغیرہ نکالتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس کو گوڈی دینا کہتے ہیں۔ آپ پتہ نہیں کیا کہتے ہیں۔

اور یہی حال بچوں کا ہوتا ہے۔ کوئی بھیڑیں چرا رہا ہے۔ کوئی جانور سنبھال رہا ہے۔ اور کوئی کچھ کر رہا ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو تعمیر کا سلسلہ ہوتا ہے تو مزدور جو آتے ہیں۔ اور نہیں تو ان کو تو دیکھا ہوگا۔ صبح سے لے کر شام تک کیسے ٹوکریاں اٹھاتے ہیں۔ اور پھر جب یہ کھانے کیلئے بیٹھتے ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا نہیں ہوگا۔ کسی کے ہاں دو روٹیاں بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ساتھ پیاز کا گٹھا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اور جب کھانے بیٹھتے ہیں تو اسی کو کوٹ کے لگا لگا کے کھانا کھا لیتے ہیں۔ اور کسی نے چٹنی اور اچار رکھا ہوا ہوتا ہے۔ صبح سے لے کے شام تک ٹوکری اٹھاتے ہیں۔

مدارس میں سکون:

لیکن جن کو اللہ تعالیٰ نے دین پڑھنے کیلئے منتخب کرلیا۔ جیسے آپ حضرات کو۔ یا

ہمیں اور آپ کے اساتذے کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت کیلئے توفیق دے دی۔ شہزادوں کی طرح وقت گذارتے ہیں۔

- وقت پہ نہاتے ہو۔
- وقت پہ منہ دھوتے ہو۔
- کپڑے دھلے ہوئے پہنتے ہو۔

اور باہر کی گرد چاٹنے کی بجائے مسجد میں بیٹھے ہو۔ درسگاہوں میں بیٹھے ہو۔ چند منٹ کیلئے بھی اگر بجلی چلی جاتی ہے تو آپ لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت پنکھے آپ کے لیے چلتے ہیں۔ ہوا دیتے ہیں۔ وقت پہ روٹی ملتی ہے۔ وقت پہ سالن ملتا ہے، اور تازہ ملتا ہے، پانی ٹھنڈا ملتا ہے، دس دفعہ نہاؤ، تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں۔

میں تو اکثر دیکھا کرتا ہوں۔ اور میرا یہ تجربہ ہے۔ اور آپ بھی دیکھتے ہوں گے۔ کہ یہاں رہتے ہوئے بچوں کے چہروں پر جو نورانیت اور صفائی ہوتی ہے۔ اگر چار دن کے لئے چھٹی پہ چلے جائیں پھر جب واپس آتے ہیں۔ تو آدھا حسن ضائع کر کے آتے ہیں۔ جب گھر سے ہو کے آتے ہیں۔ چہروں پر وہ رونق نہیں ہوتی۔

تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ آپ مدرسے میں بہت خوشحال وقت گذارتے ہیں۔ جو خوشحالی آپ کو گھر میں بھی نصیب نہیں ہے۔ آرام کے ساتھ سوتے ہو۔ آرام کے ساتھ اٹھتے ہو۔ سیر کرتے ہو۔ ٹہلتے ہو۔ میں آپ کو متوجہ کر رہا ہوں کہ آپ ذرا باہر کی زندگی جو گھر میں ہے۔ جو بچے یہاں پڑھنے نہیں آتے۔ گھر میں وقت گذارتے ہیں ان کو دیکھو۔

- ان کا پہناوا دیکھو......... اور اپنا پہناوا دیکھو۔
- انکی شکل وصورت دیکھو......... اور اپنی شکل وصورت دیکھو۔
- ان کے آرام کے حالات دیکھو......... اور اپنے آرام کے حالات دیکھو۔

تو تمہیں پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی عیش اور عشرت کے ساتھ آپ

لوگوں کو دین پڑھنے کیلئے بٹھایا ہوا ہے۔ اور کتنی راحت دی ہوئی ہے۔ ہم تو صبح، شام اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہی عزیز، رشتہ دار، ہمارے ہی ہم عمر، جو اس سلسلے میں نہیں لگے۔ جیسا وقت وہ گھروں میں گذارتے ہیں۔

- چاہے دکان میں گذاریں۔
- چاہے فیکٹریوں میں گذاریں۔

جب ہم ان کو دیکھتے ہیں۔ تو اللہ کا شکرادا کرتے ہیں۔ کہ اللہ نے کتنی عزت اور راحت کے ساتھ کھانے پینے کیلئے دے رکھا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں زیادہ دے رکھا ہے۔ وہ پریشانیاں جن میں وہ مبتلا ہیں ان سے اللہ نے ہمیں بچایا ہوا ہے۔ تو لوگوں کے حالات کو دیکھا کرو۔ مہنگائی کی وجہ سے لوگوں میں کتنی تنگی ہے۔ ماں باپ کس طرح سے پریشان ہیں۔ اور یہاں کچھ فکر نہیں۔ چاردیواری کے اندر بیٹھے ہوئے ہو۔ اور اللہ کی طرف سے نعمتیں آسمان سے بارش کی طرح برستی ہیں۔ اور سال کے دوران میں جتنا گوشت تم کھاتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ گھروں کے اندر اتنا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

مدارس کا شکر:

تو یہ بات تقاضا کرتی ہے۔ کہ اس ادارہ جس کی چاردیواری میں ہم بیٹھے ہیں۔ (باقی اداروں میں بھی ایسے ہی ہے۔ لیکن ہم اپنے گھر کی بات کرتے ہیں۔) کہ جس نے سال بھر ہمیں عیش کروائی۔ اور جس کے اندر رہتے ہوئے ہم نے سال بھر راحت وآرام سے وقت گذارا۔ ٹھنڈے سائے کے اندر ہم نے اپنا وقت گذارا۔ اور بھوک، پیاس کا پورا پورا تدارک یہاں تھا۔ کوئی بھوک برداشت نہیں کی کوئی پیاس برداشت نہیں کی۔ اور تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ تمہاری خوراک اور تمہاری بجلی پہ کتنا خرچہ آتا ہے؟۔ اور کہاں سے پورا ہوتا ہے؟۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عنایات ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا جائے۔

اور شکرادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو

نعمت کے درمیان واسطہ بنے۔ اس واسطے کا شکر جب تک ادا نہ کیا جائے۔ اس وقت تک اللہ کے شکر کا حق ادا نہیں ہوتا۔

((مَن لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ))

جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کیا۔

تو سب سے پہلے تو ہمارے اوپر احسان ہے۔ اس چاردیواری کے ادارے کا۔ (ترمذی ۲/۱۷۔ مشکوۃ ۱/۲۶۱)

جس کو ہم باب العلوم کہتے ہیں۔ یہ مجموعی کیفیت ہے جس میں سب کچھ آ گیا۔

اور پھر

- یہاں کے اساتذہ۔
- یہاں کے منتظمین۔
- یہاں کی کتابیں۔
- یہاں کی درسگاہیں۔

سب چیزیں آپ حضرات کیلئے واسطہ بنتی ہیں۔ اس علم کے حاصل ہونے کا اور اس راحت کے میسر آنے کا۔ تو

﴿لَئِن شَكَرتُم لَأَزِيدَنَّكُم﴾ (سورہ ابراھیم. آیت.۷)

اللہ کا وعدہ ہے۔ کہ اگر تم شکر گزار ہوتے رہو گے تو اللہ اور زیادہ دے گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔

شکر گزاری کے تقاضے:

تو شکر گزاری کے تقاضے کیا ہیں؟ شکر گزاری کے تقاضے یہ ہیں۔ جس طرح سے آپ کا یہ نظم پڑھنے والا پڑھ رہا تھا۔

ادارے کی شکر گزاری یہ ہے کہ اس کے لیے نیک نامی کا باعث بنو۔ اس کے لیے بدنامی کا باعث نہ بنو۔ اور ادارے کی نیک نامی کیسے ہوگی۔ ادارے کی نیک نامی

اس طرح ہوگی۔ کہ آپ علم اور عمل دونوں کے اندر ممتاز ہو کے رہیں۔ جب آپ باہر جائیں تو دیکھنے والے کہیں۔ واقعی بچہ وہاں سے آیا ہے تو

- یہ علم کے زیور سے آراستہ ہے۔
- اس کی شان عالمانہ ہے۔
- اس کے اخلاق عالمانہ ہیں۔
- اس کی زبان عالمانہ ہے۔
- اس کا اٹھنا، بیٹھنا عالمانہ ہے۔
- اس کا رہن، سہن عالمانہ ہے۔
- اس کا طور، طریقہ عالمانہ ہے۔
- اس کی چال، ڈھال عالمانہ ہے۔
- اس کی سوچ، فکر عالمانہ ہے۔
- اس کی تہذیب، تمدن عالمانہ ہے۔
- اس کا اخلاق، کردار عالمانہ ہے۔

تو پھر لوگ کہیں گے۔ واقعی جس مدرسے سے پڑھ کے آیا ہے۔ وہاں تعلیم بھی اچھی ہے۔ تربیت بھی اچھی ہے۔ اور یہ ہوگی مدرسے کی نیک نامی۔ پھر جو بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھیں گے۔ کہ یہ کس مدرسے میں پڑھتا ہے۔ ہم بھی بچے کو وہاں بھیجتے ہیں۔ جہاں جہاں آپ جائیں گے لوگوں کیلئے ایک تعارف کا ذریعہ بنیں گے۔ کہ اس بچے کی حالت بتاتی ہے۔ کہ وہاں تعلیم کا انتظام بھی اچھا ہے۔ تربیت کا انتظام بھی اچھا ہے۔

- لڑکے اخلاق سے بولتے ہیں۔
- ماں، باپ کا ادب کرتے ہیں۔
- ماں، باپ کی خدمت کرتے ہیں۔

- گھر میں بہن، بھائیوں سے محبت کرتے ہیں۔
- ان کی زبان گندی نہیں۔
- یہ آوارہ پھرتے نظر نہیں آتے۔
- ہوٹلوں پہ بیٹھ کے آوارہ گردی نہیں کرتے۔
- فلمیں نہیں دیکھتے۔۔ٹی وی نہیں دیکھتے۔
- پانچ وقت نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔
- جب دیکھو مسجد کی طرف آرہے ہیں۔
- جب دیکھو مسجد سے جارہے ہیں۔
- جب دیکھو ہاتھ میں کتاب ہے۔
- جب دیکھو مطالعہ کررہے ہیں۔
- جب دیکھو تلاوت کررہے ہیں۔

آپ کے یہ حالات جب ان کے سامنے آئیں گے تو گھر والے بھی خوش ہوں گے۔اور باہر والے دیکھ کے بھی پہچانیں گے کہ واقعتاً اس لڑکے کی حالت بہت اچھی ہو گئی۔ بمقابلہ ان لڑکوں کے جو مدرسوں میں نہیں جاتے۔تو یہ مدرسے کی نیک نامی ہوگی۔

مدارس کی نعمتوں پر ناشکری کی حقیقت:

اور اگر الٹا آپ نے اس کی بدنامی شروع کردی۔۔ بدنامی کیا ہوا کرتی ہے، جس وقت آپ کوئی گڑبڑ کریں گے، نماز نہیں پڑھیں گے، تو ماں باپ بھی کہیں گے کہ پتہ نہیں تمہیں تمہارے استادوں نے کیا سکھایا، اس مدرسے کے اندر تم کیا پڑھ کے آئے ہو؟ وہاں نماز کی پابندی نہیں کرواتے؟۔ اسی طرح جب تم ماں باپ کے سامنے اکڑو گے اور ان کو تکلیف پہنچاؤ گے۔ پریشان کرو گے۔تو وہ کہیں گے۔کہ کیا پڑھ کے آئے ہو تم؟۔اس مدرسے میں کیا سیکھ کے آئے ہو؟۔کیا مدرسے والوں نے تمہیں یہی

سکھایا؟ کہ تم ماں باپ کا ادب نہ کرو۔

اور جب تم آوارہ مجلسوں میں بیٹھو گے، بازار میں آوارہ گردی کرو گے۔ اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ پھرو گے۔ تو دیکھنے والا ہر کوئی کہے گا کہ جہاں پر پڑھ کے آیا ہے، وہاں تربیت وغیرہ کچھ نہیں ہے۔

علم تو دل میں ہوتا ہے۔ اس کو تو لوگ نہیں دیکھتے کہ آپ کے دل میں علم کتنا ہے۔ کتنا نہیں؟۔ لیکن آپ کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، گفتگو کرنا۔ معاملات اور اخلاق۔ یہ ایک نمایاں چیز ہے۔ جو ہر کسی کو نظر آتی ہے۔

تو یہ نمایاں چیز جس وقت آپ اچھی کریں گے۔ تو لوگ کہیں گے کہ مدرسہ بھی اچھا ہے۔ مدرسے کے اساتذہ بھی اچھے ہیں۔ اور اگر تم اس نمایاں چیز کو بدنما کرو گے۔ اور کہو گے کہ...... نہیں...... ہمارے دل میں بہت علم بھرا ہوا ہے...... ہمیں شرح جامی بھی زبان یاد ہے...... شرح عقائد بھی زبان یاد ہے...... ہم نے اتنے نمبر لیے...... لوگ کہیں گے۔ کیا فائدہ؟ ہمارے سامنے تو تمہارا اخلاق ایسا ہے۔ کہ جب دیکھو آوارہ پھر رہے ہو۔ آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ پھر رہے ہو۔ نماز کی پرواہ نہیں...... والدین کے گستاخ ہو...... والدین کی خدمت نہیں کرتے...... تو کیا فائدہ ہوا اس علم کے پڑھنے کا؟۔

ناشکری کا انجام:

اگر آپ کے حالات اس قسم کے ہوئے تو یہ ناشکری ہوئی۔ اور اس ناشکری کے نتیجے میں اللہ کی گرفت آتی ہے اور علم میں برکت نہیں ہوتی۔ (یہ بات اچھی طرح سے یاد رکھیں) اس لئے رخصتی کے وقت میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ یہاں سے تہیہ کر کے جاؤ۔ کہ جہاں آپ جائیں گے۔ جن کے ساتھ آپ ملیں گے۔ جہاں آپ رہیں گے۔ لوگ یہ کہیں کہ واقعی معلوم ہوتا ہے۔ مدرسہ اچھا ہے۔ جس میں تعلیم بھی اچھی ہے۔ تربیت بھی اچھی ہے۔ نماز کی پابندی کریں۔ مسجد میں جائیں۔ وہاں اذان کہیں۔ وہاں

تلاوت کریں۔ گھر میں اپنے اخلاق کے ساتھ والدین کو متاثر کریں۔ بہن بھائیوں کو متاثر کریں۔ تو یہ ہے کہ آپ نے اس مدرسے میں جو کچھ نعمتیں اٹھائی ہیں۔ ان کا شکر یہ یہ ہے کہ اس طرح سے آپ نیک نامی کا باعث بنیں۔ بدنامی کا باعث نہ بنیں۔

اساتذہ کا احسان:

اور یہی حال ہے اساتذہ کا۔ کہ اساتذہ نے آپ کیلئے محنت کی۔ یہ بات ذہن میں رکھیں۔ کبھی کسی کے دل، دماغ میں نہ آئے۔ اس کے خلاف بات دل، دماغ میں نہ آئے۔ اساتذہ آپ کو تعلیم مفت دیتے ہیں۔ آپ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔

یہ کالجوں، سکولوں کی بیماری عربی مدارس میں بھی آتی جارہی ہے۔ کالج اور سکول میں استاد کا ادب دل سے نکل گیا۔ کیوں نکل گیا؟۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ پیسے دیتے ہیں۔ پڑھتے ہیں۔ ایک کام وہ کرتے ہیں۔ ایک کام ہم کرتے ہیں۔ وہ اگر پڑھاتے ہیں تو ہم پیسے دیتے ہیں۔

خاص طور پر ٹیوشن پڑھنے والے تو یہی سمجھتے ہیں۔ کہ استاد اگر ہمیں پڑھانے کیلئے آتا ہے اور ہم پر محنت کرتا ہے تو ہم اسے پیسے دیتے ہیں۔ برابری کا معاملہ ہے۔ جیسے علامہ اقبال کی ایک رباعی ہے۔ جس میں یہ بات ہے،

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پڑھ کر سبق
کہتا ہے استاد سے کہ بل پیش کیجئے۔

کہ آپ کی محنت کا بل کیا ہے؟۔ کتنے دن آپ آئے ہیں؟ کتنے دن آپ نے ناغہ کیا ہے؟۔ ۵۰۰ آپ کی ماہوار ٹیوشن تھی۔ کتنے دن آپ نے ناغہ کیا ہے۔ آپ کی ٹیوشن کتنی بنتی ہے۔ بل پیش کردو۔ اب یہ بات ہوتی ہے۔ اور پہلے بات وہ تھی جو پہلے شعر میں ہے،

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاذ کے عوض
دل چاہتا تھا ھدیۂ دل پیش کیجئے

لیکن بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

اب معاملہ ایسا ہو گیا۔ وہاں تو بات ہوگئی لینے دینے کی۔ جس کی بناء پر کوئی ادب نہیں رہا۔ کوئی احترام نہیں رہا۔ استاد کو پیٹ بھی دیتے ہیں۔ استاد کو گالیاں بھی دے دیتے ہیں۔ کالجوں میں، سکولوں میں، یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ بالکل برابر کی سطح کا معاملہ ہو گیا۔ کوئی استاد کا ادب واحترام نہیں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ تجارت بن گئی۔

اساتذہ آپ سے معاوضہ نہیں لیتے:

لیکن الحمد للہ یہاں یہ بات نہیں۔ آپ یہ نہ سوچ لیں کہ ہم تنخواہ لیتے ہیں۔ تنخواہ آپ سے نہیں لیتے۔ آپ کو ہم مفت پڑھاتے ہیں۔ صرف مفت پڑھاتے نہیں۔ بلکہ مانگ مانگ کے کھلاتے ہیں۔ آپ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہم گداگری کرتے ہیں۔ مانگ مانگ کے لاکے آپ کو کھلاتے ہیں۔

اس لئے یہاں سکولوں اور کالجوں والی بات نہیں کہ ہم بالعوض پڑھاتے ہیں۔ بالعوض یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ جس کو پڑھایا جائے اسی سے معاوضہ لیا جائے اور فیس لی جائے۔ جیسے استاد ٹیوشن پڑھاتا ہے تو لڑکا یا اس کے والدین پیسے دیتے ہیں۔ ہم تو آپ سے نہ فیس لیتے ہیں۔ نہ ٹیوشن کے طور پر کوئی پیسے لیتے ہیں۔ بلکہ ہم تو آپ کی مفت خدمت کرتے ہیں۔ آپ کی تعلیم والی خدمت بھی کرتے ہیں۔ اور آپ کی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔

باقی رہا معاوضہ....... تو معاوضہ تو ایسے ہوتا ہے۔ جس طرح سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جس وقت خلیفہ نہیں بنے تھے۔ تجارت کرتے تھے۔ کپڑا بیچتے تھے۔ خاندان کو پالتے تھے۔ اور جب خلیفہ بن گئے تو اعلان کر دیا کہ

''اب میں قوم کی خدمت کروں گا۔ قوم کے خزانے سے کھاؤں گا''

تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی قوم کے خزانے سے وظیفہ لیا۔ اور خلفاء،

قاضی جتنے تھے۔ وہ لیتے تھے۔ اس وقت قوم کا خزانہ اسلامی کاموں کیلئے بھی ہوتا تھا۔

- آج سکول کا پروفیسر قومی خزانے سے لیتا ہے۔
- عدالت کا جج قومی خزانے سے لیتا ہے۔
- تھانے کا تھانیدار قومی خزانے سے لیتا ہے۔
- ڈی ایس پی قومی خزانے سے لیتا ہے۔
- سرکاری ہسپتال کا ڈاکٹر قومی خزانے سے لیتا ہے۔
- بینک منیجر قومی خزانے سے لیتا ہے۔
- فوجی آفیسر قومی خزانے سے لیتا ہے۔

سب لیتے ہیں۔ لیکن آگے جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ کے سامنے ہے۔ لیکن علماء کے لئے اس قومی خزانے میں کچھ نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے نجی بیت المال قائم کر لیے۔ کہ نجی بیت المال میں وہ

- اپنی زکوٰۃ جمع کراتے ہیں۔
- اپنے صدقات جمع کراتے ہیں۔
- اپنی خیرات جمع کراتے ہیں۔
- اپنے عطیات جمع کراتے ہیں۔
- اپنا عشر جمع کراتے ہیں۔

تو وہاں سے پھر اساتذہ جنہوں نے قوم کے بچوں کے لئے اپنا وقت دے رکھا ہے۔ تو قوم ان کی ضروریات پوری کرتی ہے۔ پیسے دینے والا کوئی ہے۔ پڑھنے والے کوئی ہیں۔ جو پڑھنے والے ہیں، ان سے کچھ نہیں لیا جاتا۔ نہ ان سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ طے ہوتا ہے۔

اس لئے جو ہم لیتے ہیں۔ وہ قوم سے لیتے ہیں۔ قوم کا نجی بیت المال ہے۔ وہ ہم پر اعتماد کر کے نجی طور پر اسلامی خدمت کے لیے پیسے جمع کرواتے ہیں۔ جو دیتے

ہیں، ہو سکتا ہے ان کا ایک بچہ بھی مدرسے میں نہ پڑھتا ہو۔ اور جن کے بچے پڑھتے ہیں۔ بسا اوقات وہ ایک روپیہ بھی سالانہ نہیں دیتے۔ اس لئے یہاں وہ بات نہیں۔

- ہم آپ سے فیس نہیں لیتے۔
- ہم آپ سے تنخواہ نہیں لیتے۔
- ہم آپ سے وظیفہ نہیں لیتے۔
- ہمارا خرچہ آپ لوگوں کے ذمے نہیں۔
- ہم آپ سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں لیتے۔

اس لئے آپ اس بات کا خیال کریں کہ اساتذہ آپ کی مفت خدمت کرتے ہیں۔ اور جتنا وقت وہ دیتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں میں بھی دیکھ لو۔ سکول میں تو وہ پڑھاتے نہیں۔ خارجی وقت میں پڑھاتے ہیں تو کتنی بڑی بڑی ٹیوشنیں لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہاں چھ گھنٹے تعلیم کے ہیں تو چار گھنٹے استاذ اوپر دیتا ہے۔ اور اس کا بھی کسی قسم کا معاوضہ نہیں۔

- ظہر کے بعد دیکھو............ استاذ بچوں کو لیے بیٹھا ہے۔
- عشاء کے بعد دیکھو............ طالب علموں کو لیے بیٹھا ہے۔
- رات کو آپ کی نگرانی............ دن کو آپ کی نگرانی۔

بہت بڑا احسان ہے ان اساتذہ کا۔ جو آپ کی خدمت کرتے ہیں۔ اور آپ کی طرف اس نسبت کو........ اس فیض کو......... اس علم کو......... اس نور کو...... منتقل کرتے ہیں۔

اساتذہ کی شکرگزاری:

تو ان کا شکریہ تو مستقل ادا کرنا چاہیے۔ اور ان کے شکریے میں یہ بات یاد رکھیے۔

ایک تو ان کے لئے صحت کی، عافیت کی، عملی ترقی کی، خاتمہ بالخیر کی، ہر بھلائی کی

دعا کرنا، یہ بھی ایک حقوق کی ادائیگی کا طریقہ ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ

''اگر کوئی شخص پہلے والدین کا نافرمان بھی ہو۔ تو اگر مرنے کے بعد ان کے لئے ایصال ثواب کرتا رہے۔ تو اس کو اللہ تعالیٰ فرمانبردار لکھ دیتے ہیں''

(مشکوۃ ۱/۱۵۴۔ معجم کبیر ۱۹/۸۵، ۴۴۹)

اگر والدین کا حق دعا کرنے کے ساتھ اداء ہو سکتا ہے۔ تو اساتذہ کا درجہ تو والدین کے بعد ہے۔ ان کا حق بھی دعا کرنے کے ساتھ بطریق اولیٰ ادا ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی نقص، کوئی عیب (استاذ آخر انسان ہے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں آدم زاد ہوں ...... انسان ہوں ...... بشر ہوں ...... بھول چوک میرے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے ...... اور اسی طرح آپ کے باقی اساتذہ ...... ان کے ساتھ بھی بھول چوک لگی ہوئی ہے۔) تو اگر انسان ہونے کی حیثیت سے ...... ایک آدمی ہونے کی حیثیت سے ...... کسی قسم کا عیب اور نقص ...... کوئی معصیت کا کام ...... کوئی لغزش ...... جیسے کہ انسانوں سے اکثر ہوتی ہے ...... کسی استاد کی ...... اگر علم میں ہو۔ تو اسکی تشہیر کرنا۔ یہ انتہائی درجے کی ناشکری ہے۔ بلکہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ اسکی اس کمی کا ازالہ کر دے۔ اور اس کی جتنی کوتاہیاں ہیں۔ قصور ہیں۔ اللہ ان کو معاف کر دے۔ یہ بھی طلبہ کے اوپر اساتذہ کا ایک حق ہوا کرتا ہے۔ جیسے آپ اپنے والدین کیلئے استغفار کرتے ہیں۔ اساتذہ کیلئے بھی استغفار کریں۔ آخر جیسے آپ کے والدین بھی تو انسان ہی ہیں۔ ان میں بھی بیسیوں کمیاں، کوتاہیاں ہوتی ہیں، آپ ان کی تشہیر کرنے کی بجائے ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اگر کسی استاد کی کمی ...... میری کی کوتاہی ...... کسی دوسرے کی کمی کوتاہی ...... اگر آپ کے سامنے ہے۔ تو اس کیلئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔ کہ یا اللہ! ہمارے استاذ کی غلطی معاف کر دے ہمارے استاد سے جو کوئی بیشی ہوئی، معاف کر دے۔ تو والدین کے لیے بھی استغفار، استاد کیلئے بھی استغفار، یہ بھی استاد کے حق کی ادائیگی ہے۔

جب یہ آپ کریں گے۔ تو ان شاء اللہ العزیز اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں برکت دے گا۔ عمل میں برکت دے گا۔ آنے والی نسل آپ سے چلے گی۔

باب العلوم کی ترقی کا راز:

میں آپ کے سامنے ایک حقیقت عرض کرتا ہوں۔ میں یہ دعا کیا کرتا ہوں۔ اور الحمد للہ میں اس کے آثار دیکھتا ہوں۔ (یہ بات شاید میں نے پہلے آپ سے کبھی نہ کہی ہو۔) جب بھی اللہ تعالیٰ حرمین شریفین میں جانے کی توفیق دیتا ہے۔ سب سے زیادہ قبولیت کی جگہ ملتزم ہے۔ یہاں دعا بہت زیادہ قبول ہوتی ہے۔ (بیت اللہ کے دروازے اور حجراسود کے درمیان والی جگہ میں)۔ اور ہزار کوشش کر کے وہاں پہنچتا ہوں۔ جب بھی پہنچنے کا موقع ملے۔ یہ دعائیں میری لازمی ہیں۔ باقی اور بھی آپ حضرات کیلئے بہت کچھ کہتا ہوں۔ لیکن یہ دو دعائیں لازمی ہیں۔

ایک تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ یا اللہ! باب العلوم کو ظاہراً اور باطناً آباد کر دے۔ ظاہراً آباد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے آپ کے سامنے یہ تعمیرات ہیں۔ اور اس قسم کی دوسری ظاہراً آبادی ہے اور باطناً یہ ہے باطل فتنوں سے اللہ محفوظ رکھے۔ او، علم وعمل کی برکت نصیب فرمائے۔

دوسرے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ یا اللہ! جن طالب علموں سے آنے والے وقت میں تو نے دین کا کام لینا ہے (آخر یہ سلسلہ تو قیامت تک ہی چلنا ہے، اور آپ انسانوں نے ہی اس کو چلانا ہے۔ کوئی فرشتے تو اس کو چلانے کیلئے نہیں اتریں گے)۔ تو جن طلبہ سے تو نے آنے والے وقت میں دین کا کام لینا ہے۔ یا اللہ! ان کے قلوب باب العلوم کی طرف متوجہ کر دے۔

اور میں یہ واقعہ کہہ رہا ہوں۔ اور سارے ملک کے مدارس میرے سامنے ہیں۔ کہ تھوڑے سے عرصے میں۔ جتنے دین کے خادم باب العلوم نے پیدا کیے ہیں۔ شاید کسی بڑے مدرسے سے بھی اتنے نہ نکلے ہوں۔ جدھر جاؤ۔ یہی نظر آتا ہے کہ باب العلوم کے

فضلاء پڑھا رہے ہیں۔

- کوئی درجہ قرآن میں پڑھا رہا ہے۔
- کوئی درجہ کتب میں پڑھا رہا ہے۔
- کوئی کہیں امام لگا ہوا ہے۔
- کوئی کہیں خطیب لگا ہوا ہے۔
- کوئی کہیں مدرس لگا ہوا ہے۔
- کوئی باطل کے خلاف برسر پیکار ہے۔
- کوئی میدان جہاد میں مصروف عمل ہے۔
- کوئی تبلیغ کے سلسلے میں اپنے آپ کو کھپائے ہوئے ہے۔

یہ ہمارے لئے بہت زیادہ خوشی کی بات ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ اگر کسی کے متعلق پتہ چلے۔ کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد

- اس نے بی اے کرلیا۔
- اس نے ایم اے کرلیا۔
- اس نے ڈاکٹریٹ کرلی۔
- وہ کالج میں پروفیسر لگا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کے صدمہ ہوتا ہے، خوشی نہیں ہوتی۔ جو پڑھ پڑھا کے دین میں نہیں لگے۔ بلکہ اپنے پیٹ کو پالنے اور اپنے خاندان کو پالنے کی فکر کی ہے۔ دین کی ان کو فکر نہیں۔ ان سے ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

دیہات میں قرآن پڑھنے والوں کی عظمت:

اور اگر کوئی دیہات میں چٹائی پہ بیٹھا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو قرآن پڑھا رہا ہے۔ واللہ العظیم کہتا ہوں کہ دیکھ کے دل خوش ہو جاتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ ہیں جو دیہات سے بچے اکٹھے کرتے ہیں۔ اور

- انہیں بچوں میں سے حافظ بنتے ہیں۔
- انہیں بچوں میں سے قاری بنتے ہیں۔
- انہیں بچوں میں سے عالم بنتے ہیں۔
- انہیں بچوں میں سے مفتی بنتے ہیں۔
- انہیں بچوں میں سے مناظر بنتے ہیں۔
- انہیں بچوں میں سے محقق بنتے ہیں۔

اس طرح دین کا کام چلتا ہے۔ یہ ایسے ہے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے چشمے اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر تالاب بھرتا ہے۔ دیہات کے چھوٹے مدرسوں کی یہ حالت ہے۔ کہ ایک ایک آدمی دیہات کے دس دس۔ پندرہ پندرہ۔ بچوں کو لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ پانی کا ایک سوتا ہے جہاں سے پانی آرہا ہے۔ اور وہ دیہات کے بچوں کو تیار کرتا ہے۔ ناظرہ قرآن پڑھاتا ہے۔ حفظ کرواتا ہے۔ بعد میں [illegible] میں بھیج

دیتا ہے۔ اس طرح وہ آکے عالم بن جاتے ہیں۔

اس لئے دیہات کے چھوٹے مدرسے میرے نزدیک بہت قابل قدر ہیں۔ اصل تو ان کی محنت ہے، آپ دیکھ لیں۔ آپ سیدھے باب العلوم نہیں پہنچے۔ بلکہ پہلے چھوٹے مدرسے نے آپ کو گھیرا۔ کسی استاذ نے آپ پر محنت کی۔ بعد میں آپ ادھر آئے۔

تو یہ دعا میری لازماً ہوتی ہے۔ کہ "یا اللہ! ایسے بچوں کو باب العلوم میں بھیج کہ جنہوں نے آنے والے وقت میں دین کی خدمت کرنی ہے۔ اور یہ تو ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ لڑکا بعد میں تیرے دین کی خدمت کرے گا۔ تو اس کا دل باب العلوم کی طرف متوجہ کردے"۔

اور جنہوں نے پڑھ پڑھا کے دنیا کمانی ہے۔ ان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ باب العلوم کے اثرات باہر میں نے

بہت دیکھے ہیں۔ اور تھوڑے سے وقت میں جتنا حلقہ باب العلوم کا بنا ہے۔ پڑھنے پڑھانے والوں کا پرانے مدرسوں کے برابر بلکہ زائد ہوا ہے۔ کم نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا اس کا فیضان رکھا ہے۔ تو یہ اس قسم کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

آخری نصیحت

ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ باقی نیت یہی رکھیں کہ پڑھنے کے بعد پڑھانا ہے۔

اور اس دین کو

- چاہے امامت کی شکل میں۔
- چاہے خطابت کی شکل میں۔
- چاہے تصنیف کی شکل میں۔
- چاہے تبلیغ کی شکل میں۔
- چاہے جہاد کی شکل میں۔
- چاہے تدریس کی شکل میں۔
- چاہے درجہ کتب میں ہو۔
- چاہے درجہ قرآن میں ہو۔

اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں۔ تاکہ آنے والے وقت میں اللہ آپ کو یہ توفیق دے۔ اصل کے اعتبار سے ہمارا اور مدرسے کا شکریہ یہ ہے کہ جو کچھ آپ یہاں سے لیں۔ اس کو آگے پھیلائیں۔ صرف پیٹ کی فکر نہ ہو۔

ان باتوں کا آپ خیال رکھیں۔ اب سال ختم ہو رہا ہے۔ تو ایک دوسرے سے جو کوئی تکلیف ہو، کوئی دکھ ہو، کوئی صدمہ ہو، سب معافی تلافی کر کے، دل صاف کر کے یہاں سے رخصت ہوں۔ طلباء آپس میں بھی اور

❀ اساتذہ کرام سے بھی مل کر جائیں۔

❀ ان سے دعائیں لے کر جائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کی خدمت میں مصروف رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ العالمین

تقویٰ (اوّل)

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذَالِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

متقین کے فضائل:

سورہ کہف کی جو آیت آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔ اے ایمان والو! اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اللہ سے ڈرو۔ اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ صادقین کی معیت اختیار کرو۔

اللہ سے ڈرنے کے متعلق قرآنِ کریم میں متعدد آیات امر کی صورت میں بھی آئی ہیں۔ جن میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور صفت کی صورت میں بھی آیات آئی ہیں۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے متقین کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اور متقین کیلئے

- آخرت کی کامیابی۔
- جنت کی نعمتیں۔
- دنیا کی راحت وسکون۔
- درجات کی بلندی۔

متقین۔ کے لفظ کے ساتھ ذکر کی۔ کہ جو لوگ متقی ہیں۔ تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت میں کیا نعمتیں دیتا ہے۔ تو یہ صفت کے انداز میں بھی تقویٰ کی تعریف، تقویٰ کی ترغیب، اور تاکید بہت ساری آیات میں آئی ہے۔

تقویٰ کی حقیقت:

تقویٰ کہتے کسے ہیں؟ چونکہ آپ سب طالب علم ہیں۔ اس لیے طالب علمانہ انداز میں ہی آپ کو سمجھاتا ہوں۔ کہ تقویٰ میں جو تاء ہے اصل کے اعتبار سے واؤ سے بدلی ہوئی ہے۔ ''تقویٰ'' اصل میں ''وقوی'' تھا۔ اور یہ باب ہے ''وَقٰی، یَقِی، وِقَایَۃً'' جس کا معنی ہے بچانا، جیسے قرآن کریم میں ہے۔

''وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' (سورہ بقرہ آیت ۲۰۱۔ آل عمران آیت ۱۶)

اس میں ''قِ'' امر کا صیغہ ہے۔ کہ اے ہمارے رب! تو ہمیں آگ کے عذاب

سے بچا۔ پھر مجرد سے اس کو باب افتعال پہ لے گئے۔
تو یہ لفظ بن گیا" اِوتِقَاء "۔"وْ" کے بعد۔ تائے افتعال آگئی۔ اور فاء کلمہ کے مقابلے میں واؤ ہے۔ اور آپ نے صرف کے اندر یہ قاعدہ پڑھا ہے۔ کہ باب افتعال کے فاء کلمہ کے مقابلے میں واؤ ہو یا یاء اصلی ہو۔ تو اس کو تاء کر کے۔ تاء کا تاء میں ادغام کر دیا کرتے ہیں۔ مثال آپ نے پڑھی تھی جیسے" اِتَّقَدَ "اصل میں تھا" وَقَدَ۔ پھر اس سے بنا" اِوتَقَد "۔ پھر اس کو بنالیا" اِتَّقَد "۔
اور دوسری مثال آپ نے پڑھی تھی۔" اِتَّسَرَ "۔ یہ اصل میں تھا" یَسَرَ "۔ اس سے بنا" اِیتَسَرَ " پھر یاء کو تاء کر کے تاء کا تاء میں ادغام کر دیا تو اِتَّسَرَ ہو گیا۔
اس قاعدے کے مطابق اصل میں یہاں بھی" اِوتَقَی " تھا۔ واؤ کو تاء کر کے تاء کو تاء میں ادغام کر دیا۔ تو" اِتَّقَی " بن گیا۔ تو" وقی " بچانے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور" اِتَّقَی " بچنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ تقویٰ کی حقیقت سمجھ لیجئے۔" اتَّقُوا اللّٰهَ "۔ تو اس کا اصل مفہوم یہ ہے۔ کہ اللہ کی ناراضگی سے بچو۔ اللہ کے عذاب سے بچو۔ جیسے قرآن کریم میں ہے۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (سورہ بقرہ آیت ۲۴)
"اس آگ سے بچو۔ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔"

تو اصل مفہوم اس لفظ کا ہے بچنا۔ اور بچنا عموماً چونکہ خوف اور ہیبت کی بناء پر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ترجمہ بھی اس کا اپنی جگہ صحیح ہے۔ کہ اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ جب اللہ سے ڈرو گے تو لازمی بات ہے کہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرو گے۔ اصل میں نافرمانی سے بچنا مقصود ہے۔ لغوی تحقیق کے تحت تقویٰ کا مفہوم یہ ہے۔

تقویٰ کا محل:

دوسرے لفظوں میں اگر آپ سمجھنا چاہیں۔ تو سرور کائنات ﷺ نے اس تقویٰ کی

نسبت قلب کی طرف فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے۔ کہ سرورِ کائنات ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا۔

﴿التَّقْوٰى هٰهُنَا. التَّقْوٰى هٰهُنَا. التَّقْوٰى هٰهُنَا﴾

''تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔''

تین دفعہ آپ نے فرمایا۔ سینے کے وسط کی طرف یعنی قلب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ دل میں ہوتا ہے۔ (مسلم ۲/۳۱٦۔ مشکوٰۃ ۲/۴۲۲)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل کے اعتبار سے تقویٰ کا محل قلب (دل) ہے۔ اور اس کے اثرات انسان کے ظاہر پر اور اس کے اعضاء پر آتے ہیں۔ ورنہ اصل تقویٰ قلب (دل) میں ہوتا ہے۔

انسان کے جسم میں مختلف قوتیں

اس کو سمجھنے کیلئے آپ یوں خیال کریں۔ کہ ہمارے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک قوتِ عمل رکھی ہے۔ یعنی کام کرنے کی قوت جس کو قوتِ فاعلہ کہتے ہیں۔

- ہمارے اندر دیکھنے کی قوت ہے۔
- ہمارے اندر بولنے کی قوت ہے۔
- ہمارے اندر سننے کی قوت ہے۔
- ہمارے اندر کھانے کی قوت ہے۔
- ہمارے اندر چلنے کی قوت ہے۔
- ہمارے اندر پکڑنے کی قوت ہے۔

ہم یہ سارے کے سارے جو کام کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے اندر اللہ تعالیٰ نے مختلف قوتیں رکھی ہیں۔ اور ان قوتوں کا ظہور ہمارے اعضاء سے ہوتا ہے۔

- دیکھنے کی قوت ہماری آنکھ میں ہے۔
- سننے کی قوت ہمارے کان میں ہے۔

- سونگھنے کی قوت ہمارے ناک میں ہے۔
- کام کرنے کی قوت ہمارے ہاتھ میں ہے۔
- چلنے کی قوت ہماری ٹانگوں میں ہے۔
- بولنے کی قوت ہماری زبان میں ہے۔

یہ ساری کی ساری قوتیں جو ہیں۔ اصل کے اعتبار سے آپ ان کو قوئی فاعلہ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی کام کرنے کی قوتیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بدن کے اندر مختلف انداز میں رکھی ہیں۔

قوتوں کیلئے بریک

اور ان سب کو کنٹرول کرنے کیلئے اور بریک لگانے کیلئے ایک جذبہ ہمارے اندر ہے جس کو ہم تقویٰ کہتے ہی۔ تو تقویٰ اصل کے اعتبار سے ہماری فاعلی قوت کے لیے بریک ہے۔ بریک کا لفظ تو آپ سمجھتے ہیں۔

- آپ سائیکل چلاتے ہیں۔ اس میں بھی ایک بریک ہوتی ہے۔
- آپ موٹر سائیکل چلاتے ہیں۔ اس میں بھی ایک بریک ہوتی ہے۔
- آپ کار چلاتے ہیں۔ اس میں بھی ایک بریک ہوتی ہے۔
- آپ مشینری چلاتے ہیں اس میں بھی ایک بریک ہوتی ہے۔
- آپ انجن چلاتے ہیں اس میں بھی ایک بریک ہوتی ہے۔

اس بریک کا مقصد کیا ہوتا ہے؟۔ کہ چلتے چلتے اگر کوئی سامنے خطرہ پیش آجائے۔ کہ جہاں آگے چلنا خطرناک ہو تو وہاں فوراً چلنے کی قوت کو کنٹرول (Control) کرلیا جاتا ہے۔ جب آپ بریک لگائیں گے۔ تو پہیہ جام ہو جائے گا۔ جب جام ہو جائے گا تو آگے چلے گا نہیں۔ چلنے کی قوت جو تھی وہ ٹھہر گئی۔

بریک کا فائدہ:

اور یہ جو قوت ہے جس کو میں بریک کے ساتھ تعبیر کر رہا ہوں۔ اصل کے اعتبار

سے آپ کو ہلاکت سے بچانے والی چیز ہے۔

آپ سائیکل دوڑائے جا رہے ہیں۔ اور آپ کو پتہ نہیں تھا۔ کہ آگے کھڈا (گڑھا) ہے۔ اور جوں ہی اس پر نظر پڑی آپ نے بریک لگالی۔ اور آپ کی سائیکل رک گئی۔ آپ بچ گئے۔ اگر یہ بریک نہ لگتی تو آپ سر کے بل کھڈے (گڑھے) میں گرتے اور اپنی گردن تڑواتے۔ تو اس بریک نے آپ کو بچالیا۔

اسی طرح سے آپ کی کار چلتی ہے۔ موٹر سائیکل چلتی ہے۔ کوئی گاڑی چلتی ہے۔ تو جب کوئی سامنے خطرہ آتا ہے۔ کہ اگر اس وقت انجن اسی رفتار سے چلتا رہے تو

- کسی چیز سے ٹکرا جائے گا۔
- کسی گڑھے میں گر جائے گا۔
- نقصان ہو جائے گا۔
- آپ ہلاک ہو جائیں گے۔

اور بریک کا کام یہ ہے کہ اس قوت کو جو آپ کو دوڑائے جا رہی ہے۔ وہ فوراً کنٹرول (Control) کر لیتی ہے۔ اور آپ کو ہلاک ہونے سے اور برباد ہونے سے بچالیتی ہے۔

تو جس طرح سے ظاہری انجن میں ایک بریک ہے۔ کہ اگر بریک نہ ہو تو یہ انجن کتنی ہی خوبیوں کا مالک کیوں نہ ہو؟ معلوم نہیں۔ آپ کو کس کھڈے میں گرا دے گا۔ اور کہاں آپ کو برباد کرے گا؟۔ بریک اگر ہوگی تو آپ اس کو صحیح طور پر کام میں لاسکیں گے۔ فائدہ اٹھائیں گے اور ہلاکت سے بچ جائیں گے۔ تو جیسے ظاہری انجن کی رفتار کو کنٹرول کرنے کیلئے ایک بریک ہے۔ تو انسان کو جو اللہ تعالیٰ نے قوت فاعلی دی ہے، اس قوت کو بھی اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ تو یہ قوت بھی اسی طرح سے انسان کیلئے ہلاکت کا باعث بن جائے گی۔ جس طرح سے انجن کی بے تکی رفتار انسان کیلئے ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔

آنکھ پر کنٹرول:

تو آپ اپنی اس قوت سے کام لیں۔لیکن جہاں محسوس کریں۔کہ اگر اس سے آگے بڑھیں گے تو ہلاکت ہے۔تو فوراً اپنی اس قوت کے اوپر کنٹرول کرلیں۔یہ جو کنٹرول کرنے کا جذبہ اور ملکہ اللہ نے طبیعت کے اندر رکھا ہے۔اصل کے اعتبار سے یہ ہے تقویٰ۔

مثال سمجھ لیجئے۔مثلاً اللہ نے آپ کو دیکھنے کی قوت دی ہے۔آپ دیکھتے چلے جائیں۔اس آنکھ سے فائدہ اٹھائیں۔ایک جگہ ایسی آجائے گی کہ اگر آپ اس کو غور سے دیکھیں گے۔تو آپ کیلئے یہ دیکھنا وبال کا باعث بن جائے گا۔وہاں آپ کو دیکھنے کی اجازت نہیں۔

آپ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ کئی جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اگر انسان ان کو آنکھ پھاڑ کے دیکھ لے اور دیکھتا چلا جائے تو وہ ہلاکت کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔یہ وہ جگہیں ہیں جہاں دیکھنے سے شریعت میں روکا گیا ہے۔کسی عورت کو شہوت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔وغیرہ۔تو آپ آنکھ بند کرلیں۔آپ اپنی اس دیکھنے والی قوت کو کنٹرول کرلیں۔یہ تقویٰ ہے۔

ہاتھ پر کنٹرول:

آپ ہاتھ کے ساتھ کام کریں۔لیکن اگر اسی ہاتھ کے ساتھ آپ پرایا مال اٹھانے لگیں۔یا آپ کا ہاتھ کسی ایسی چیز کی طرف بڑھنے لگے۔جس سے شریعت میں روکا گیا ہے۔اگر آپ ہاتھ بڑھائیں گے۔تو آپ کیلئے ہلاکت ہوسکتی ہے۔تو یہ آپ کی اندر کی قوت فوراً آپ کے ہاتھ کو روک لے۔کہ میں یہ اٹھا سکتا ہوں لیکن یہ نہیں اٹھاتا۔اور وہاں آپ نے اپنی اس قوت کو کنٹرول کرلیا۔روک لیا۔بریک لگائی۔یہ تقویٰ ہے۔

زبان پر کنٹرول:

اسی طرح سے آپ زبان سے بولتے چلے جائیں۔لیکن اگر ایسی بات زبان پہ

آنے لگی۔ جس بات کا زبان پہ لے آنا ہلاکت کا باعث ہے۔ اور جس بات کے آنے کے ساتھ اللہ کے ناراض ہونے کا ڈر ہے۔ تو فوراً آپ اپنی زبان کو روک لیں۔ اور وہ لفظ اپنی زبان کے اوپر جاری نہ ہونے دیں۔ برا لفظ زبان پر نہ آنے پائے۔ بولنے کی قوت کو آپ نے کنٹرول کر لیا۔ روک لیا۔ تو یہ قوت جو آپ کو بولنے سے روکے گی۔ بریک کرے گی۔ اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔

تقویٰ کنٹرول اور بریک کا نام ہے:

اب آپ جانتے ہیں کہ اگر تقویٰ دل کے اندر ہوگا۔ تو آپ کی ساری حرکات کنٹرول میں رہیں گی۔ اور آپ مفید طریقے سے ان کو استعمال کریں گے اور غیر مفید طریقے سے ان کو استعمال نہیں کریں گے۔ جب کوئی غیر مفید طریقہ سامنے آئے گا۔ تو آپ رک جائیں گے۔ یہ کمال اصل کے اعتبار سے تقوے کی بنا پر ہے۔ جتنا تقوے والی قوت بڑھاتے چلے جاؤ گے۔ اتنا آپ کا اپنے اعمال کے اوپر کنٹرول زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور آپ اپنے اعضاء کو، اپنی قوتوں کو مفید کاموں میں استعمال کریں گے۔ جہاں غیر مفید کام سامنے آئے گا تو آپ اپنے آپ کو روک لیں گے۔

اس لیے سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے ایمان کے بعد انسان کو جو بڑی نعمت نصیب ہوتی ہے۔ وہ تقویٰ ہے۔ کیونکہ ایمان تقاضا کرتا ہے عمل کا۔ اور عمل صحیح تبھی ہوگا جب انسان کو اپنی حرکات پر، اپنی قوت فاعلہ پر پوری طرح سے ضبط ہو، کنٹرول ہو۔ کہ وہ صحیح کام کرے، غیر صحیح کاموں سے رک جائے۔ تب جا کے انسان اپنی زندگی صحیح انداز میں گذار سکتا ہے۔ اس تقویٰ کو حاصل کرنے کی اللہ تعالیٰ نے بار بار تاکید کی ہے۔

تو مفہوم اب آپ کے سامنے آگیا کہ تقویٰ بچنے کا نام ہے۔ اور بچنے کا مطلب یہی ہے کہ ہلاکت کی طرف جانے سے بچ جاؤ۔ آپ کی آنکھ ہلاکت کی طرف نہ

جائے۔آپ کا کان اللہ نے سننے کیلئے بنایا ہے۔لیکن جہاں آپ کے کان میں ایسی آواز آنے لگ جائے جو آپ کے ایمان کو، آپ کے اخلاق کو خراب کرنے والی ہو۔تو آپ اپنے کان کو روک لیں۔اور ایسی باتیں نہ سنیں۔

- اپنی آنکھوں کو غلط دیکھنے سے روک لیں۔
- اپنے کانوں کو غلط سننے سے روک لیں۔
- اپنی ناک کو غلط سونگھنے سے روک لیں۔
- اپنی زبان کو غلط بولنے سے روک لیں۔
- اپنے پاؤں کو غلط جگہ جانے سے روک لیں۔

جس وقت آپ میں یہ روکنے کی قوت پیدا ہو جائے گی۔تو آپ متقی ہو جائیں گے۔پھر انسان کی زندگی صحیح انداز میں گذرنے لگ جاتی ہے۔یہ تو ہے تقویٰ کا مفہوم۔

جو [illegible] میں ہے۔

﴿ يَا اَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (سورہ توبہ آیت ۱۱۹)

تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ:

" وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ "

اور اچھے لوگوں کے ساتھ رہو۔تو یہاں " وکونوا مع الصادقین " کا حکم جو دیا ہے۔اصل کے اعتبار سے حصول تقویٰ کا یہ ایک طریقہ بتایا ہے۔کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے اندر تقویٰ والی صفت پیدا ہو جائے۔اور آپ متقی ہو جائیں۔تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اچھے لوگوں کے ساتھ رہو۔صادقین کی معیت اختیار کرو۔ان کی معیت اختیار کرو گے۔تو تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے گی۔اور اللہ کا خوف تمہارے دل میں آجائے گا۔تو گویا صادقین کی معیت متقی ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔اور تقویٰ کے حاصل ہونے کا ایک طریقہ ہے۔

انسان انسان سے سیکھتا ہے:

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ اس انداز میں بنایا ہے۔ کہ اس کے اندر اللہ نے قوتیں اور صلاحتیں تو ساری رکھی ہیں۔ لیکن ان قوتوں اور صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنا کہ اس سے نیکی صادر ہو۔ اس کیلئے کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ اور ان قوتوں کو صحیح انداز میں استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان، انسان سے سیکھتا ہے ۔صرف کتاب دیکھنے سے، لفظ سننے سے، انسان کی صلاحتیں صحیح رستہ اختیار نہیں کرتیں۔ جس وقت تک اس کے سامنے کوئی عملی نمونہ نہ ہوتو۔ اور اگر عملی نمونہ سامنے ہوتا ہے تو انسان صحیح رستہ اختیار کرتا ہے۔

کتاب کے ساتھ سکھانے والا پیغمبر:

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کیلئے کتابیں اتاریں۔ اس کتاب ایک علم ہے۔ علم کا مجموعہ ہے۔ لیکن کتاب اللہ نے براہ راست آسمان سے زمین پر نہیں اتار دی۔ کہ لوگوں کے مکانوں کی چھتوں کے اوپر اتار دی ہو۔ اور یہ کہہ دیا ہو کہ بس اس کتاب کو اٹھاؤ اور پڑھتے جاؤ اور پڑھ کے عمل کرتے جاؤ۔ یہ صورت اللہ نے اختیار نہیں فرمائی۔ کہ ہر انسان کے نام ایک صحیفہ آجاتا۔ یہ کتاب بیت اللہ کی چھت کے اوپر اتار دی جاتی۔ اور کہہ دیا جاتا کہ یہ ہماری کتاب ہے۔ اس کو اٹھاؤ اور اٹھانے کے بعد اس کو پڑھو۔ اور پڑھ کے اس پر عمل کرو۔ اللہ نے ایسا نہیں کیا۔

جب بھی اللہ نے ہدایت کیلئے کتاب بھیجی۔ تو اس کتاب کے اوپر عمل کر کے دکھانے والا ساتھ بھیجا ہے۔ پیغمبر کو ساتھ بھیجا ہے۔ ایسا تو ہوا ہے کہ پیغمبر آیا مگر کتاب نہیں۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ویسے کچھ احکام دے دیے۔ تو اس نبی نے اپنے عمل کے ساتھ لوگوں کے سامنے اللہ کے احکام کو

- بتایا بھی۔
- کیا بھی۔

- اور سکھایا بھی۔

لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ نے اکیلی کتاب اتار دی ہو۔ اور ساتھ پیغمبر نہ بھیجا ہو۔ جب بھی کتاب اتری تو پیغمبر اس کو لے کے آیا۔ اور اس کا مقصد تھا۔ کہ جو علم اللہ نے کتاب کی شکل میں دیا ہے۔ اس کو کس طرح سے آپ نے عملی جامہ پہنانا ہے۔ کس طرح سے آپ نے اس کو اخذ کرنا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ساتھ عملی نمونہ پیغمبر کی شکل میں بھیجا۔ کیونکہ انسان انسان کو دیکھ کے بنتا ہے۔ انسان کو دیکھ کے سیکھتا ہے۔ صرف الفاظ سننے کے ساتھ کبھی انسان کی عملی زندگی نہیں بنتی۔

اچھی صحبت کی اہمیت:

اس لیے عام طور پر اخلاقیات کے اندر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہ

انسان اتنا کان سے نہیں بنتا، جتنا آنکھ سے بنتا ہے۔

(محاورہ ذرا یاد رکھنا)۔ یعنی انسان باتیں سن کے نہیں سدھرتا جب تک کسی کو عمل کرتا نہ دیکھے۔ عمل کرتا ہوا اپنی آنکھ کے ساتھ دیکھتا ہے۔ تو پھر انسان سدھرتا ہے۔ اس لیے تقویٰ حاصل کرنے کیلئے

- صادقین کی معیت۔
- متقین کی رفاقت۔
- اچھے لوگوں کے ساتھ رہنا۔
- نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا۔

یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔ تو شریعت نے اسی لیے ہمیں اچھی صحبت اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور بری صحبت سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے میں ان شاء اللہ العزیز اگلے بیان میں تفصیل کر دیں۔ اب میں کچھ طبعی مجبوری کی بناء پر صرف اتنے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں۔

بیان کا خلاصہ

عنوان آپ کے سامنے یہی آیا کہ تقویٰ انسان کیلئے بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان کے سامنے ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ اور اپنی عملی زندگی کو صحیح رخ پر ڈالنے کیلئے ضروری ہے کہ صحیح رخ پر چلنے والے انسانوں کے ساتھ رہے۔ ان کی معیت اور رفاقت اختیار کرے۔ تب جا کے انسان کو صحیح تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ تو صادقین کی معیت اس کی کیا ضرورت ہے؟۔ اس کی کتنی تاکید ہے۔ بری صحبت سے بچنے کی کتنی تاکید ہے۔ اور اس میں شریعت کی حکمت کیا ہے؟۔

انشاء اللہ العزیز اگلے بیان میں اس کی تفصیل کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

تقویٰ (دوم)

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

cer Demo

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ
لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.
اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى
ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.
اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ وَعَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ
كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ
وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ

تمہید

گذشتہ بیان میں یہ آیت پڑھی گئی تھی۔ اور تقویٰ کا مفہوم آپ کو بتایا گیا تھا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ اور تقویٰ کی اہمیت کیا ہے؟۔ پہلا جملہ تھا کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور دوسرا ہے کہ اچھے اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

تو بات یہاں تک پہنچی تھی۔ کہ تقویٰ کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ متقین کی، صادقین کی رفاقت اختیار کی جائے۔

انسان انسان سے متاثر ہوتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت ایسی بنائی ہے کہ یہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ کان سے سنی ہوئی بات اتنا اثر انداز نہیں ہوا کرتی۔ جتنا آنکھ سے دیکھا ہوا حال انسان کے اوپر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے آپ کے سامنے پچھلے بیان میں ایک جملہ بولا تھا کہ

"انسان آنکھ سے بنتا ہے۔ کان سے نہیں"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف کان سے وہ سنتا ہے۔ تو سننے کے ساتھ اسکی طبیعت پر ایسے اثرات واقع نہیں ہوتے۔ جتنا کہ آنکھ سے دیکھنے کے ساتھ وہ متاثر ہوتا ہے۔

اسی لیے اللہ نے اگر کتاب کی شکل میں علم اتارا ہے۔ تو اس کو متشکل کیا، مصور کیا، اس کو ایک صورت دی، انبیاء ﷺ کے عمل کے ساتھ۔ کہ وہ اپنی زبان سے ایک بات کہتے بھی تھے۔ اور کہنے کے ساتھ ساتھ کر کے دکھاتے بھی تھے۔ اثرات مکمل تب ہوتے ہیں۔ اگر صرف علم کافی ہوتا۔ تو صرف کتاب اتار دی جاتی۔ اور کتاب کے مطابق عمل کر کے دکھانے کیلئے انبیاء ﷺ کو نہ بھیجا جاتا۔ لیکن یوں تو ہوا ہے کہ اللہ نے نبی بھیجا اور اس کے ساتھ کتاب نہیں ہے۔ بلکہ پہلے کی اتری ہوئی کتاب پر ہی اس نبی

نے عمل کیا لیکن ایسا کوئی واقعہ نہیں۔ کہ اللہ کی طرف سے کتاب اتری ہو اور اس کے ساتھ نبی نہ آیا ہو۔

تو بات یہی ہے کہ انسان انسان کو دیکھ کے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے سرور کائنات ﷺ کے پاس جب کوئی شخص آتا۔ آکے مثال کے طور پر کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! قرآنِ کریم میں حکم ہے وضوء کرنے کا۔ تو وضوء کیسے کیا جاتا ہے۔

تو ایک تو ہے کہ زبان سے سمجھا دیا جائے۔ کہ ہاتھ دھوؤ۔ کلی کرو۔ ناک میں پانی ڈالو۔ منہ دھوؤ، بازو دھوؤ، مسح کرو، پیر دھولو۔

اور ایک طریقہ ہے۔ کہ پانی کا لوٹا منگوایا اور منگوا کے اس کے سامنے وضوء کر کے دکھایا۔ تو جب وضوء کر کے دکھا دیا۔ تو یہ تعلیم مکمل تعلیم ہے۔ کہ کان سے سن کے شاید اس طرح سے وضوء کرنا نہ سیکھ سکتا۔ جس طرح سے وہ حضور ﷺ کو وضوء کرتا ہوا دیکھ کر وضوء کرنے کا طریقہ سیکھ گیا۔

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات:

حضرت مولانا احمد علی لاہوری بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ وہ علماء کی جماعت کو ترجمہ پڑھاتے تھے۔ ایک دفعہ فرمارہے تھے (میں نے خود ان کی زبان سے سنا)۔ کہ میرے پاس علماء کرام پڑھنے کیلئے آتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو نماز تک کے پابند نہیں ہوتے۔ کوتاہی کرتے ہیں۔ لیکن جب یہاں آکے دو اڑھائی مہینے ٹھہرتے ہیں تو جب فارغ ہو کے جاتے ہیں تو تہجد تک کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ فرق کیا ہوتا تھا؟۔ کیونکہ طالب علمی کے زمانے میں پڑھنے میں لگے رہے۔

- کسی اچھے آدمی سے تعلق پیدا نہیں کیا۔
- کسی اچھے آدمی کی صحبت میں نہیں رہے۔
- کسی اچھے آدمی کی رفاقت اختیار نہیں کی۔

❁ کسی اچھے آدمی کی معیت اختیار نہیں کی۔

تو پڑھ تو سب کچھ لیا۔ لیکن عملی زندگی میں نہیں آیا۔ اس لیے نہیں ایا۔ کہ عمل کرنے والوں کے ساتھ وقت نہیں گذارا۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض بعض طالب علم مدرسے میں اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کہ سات آٹھ سال رہیں گے۔ لیکن ان کا کسی استاذ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی کے ساتھ کوئی خصوصی اٹھنا بیٹھنا نہیں ہوتا۔ کسی کی صحبت اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے لیے فخر اسی بات میں سمجھتے ہیں۔ کہ ہم کسی استاذ کے قریب نہیں لگتے۔ بس اپنا سبق پڑھا۔ پڑھنے کے بعد جو بھی ان کا مشغلہ ہے۔ چاہے وہ تکرار کرتے رہیں۔ چاہے وہ مطالعہ کرتے رہیں۔ چاہے کھیلتے رہیں۔ لیکن کسی اچھے استاذ کی صحبت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔

استاذ کی صحبت کا اثر:

تو جو طالب علم کسی اچھے استاذ کی صحبت میں رہے۔ وہ تو استاذ کو نماز کی پابندی کرتے ہوئے دیکھے گا۔ تو اس کو بھی نماز کی پابندی کی عادت بن جائے گی۔ استاذ کو ذکر، اذکار، وظیفہ پڑھتا ہوا دیکھے گا۔ اس کو بھی عادت پڑ جائے گی۔ استاذ کو دیکھے گا کہ یہ حقوق کا خیال کرتا ہے۔ کسی کا حق دباتا نہیں۔ جھوٹ نہیں بولتا، غیبت نہیں کرتا، تو پاس بیٹھنے والا جب بار بار اس حال کو دیکھے گا۔ تو آخر اس پر بھی اثر پڑتا جائے گا کہ۔

- جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔
- کسی کی غیبت نہیں کرنی چاہیے۔
- کسی کا حق نہیں دبانا چاہیے۔
- پسِ پشت کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔

تو استاذ کو دیکھ کر شاگرد بھی ایسی عادتیں اختیار کرتا چلا جائے گا۔

لیکن جو طالب علم کسی استاذ کے پاس بیٹھتا ہی نہیں۔ اس کی ایک اپنی دنیا ہے۔ اپنا وقت گذارتا ہے تو اپنے ماحول میں گذارتا ہے۔ اس کو کوئی اچھی صحبت نصیب نہیں

ہوتی۔تو آخر وقت تک ان کی زندگی کے اندر کوئی خاص انقلاب نہیں آتا۔حالانکہ
- حدیث کی ساری کتابیں سنی ہوئی ہوتی ہیں۔
- قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا ہوا ہوتا ہے۔
- فقہ کی کتابیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔

لیکن عمل نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے کہ عمل کے ماحول میں انہوں نے وقت نہیں گذارا۔

بے عمل بے صحبت:

اور جب وہ کسی اچھے ماحول میں جاتے ہیں۔حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ان کو اگر کہا جائے۔ کہ تہجد کی فضیلت پہ تقریر کرو،تو وہ دو دو گھنٹے تہجد کے فضائل پہ بول سکتے ہیں۔اور تقریر کر سکتے ہیں۔لیکن جب تہجد کا وقت آئے گا۔سوئے ہوئے ہوں گے۔ عمل نہیں کر کے دکھائیں گے۔ چونکہ پڑھنے کی عادت نہیں ڈالی۔پڑھنے والوں کے ساتھ نہیں رہے۔اور جب اس خانقاہی ماحول میں چلے گئے۔ بزرگوں کی رفاقت اختیار کی۔ جب ان کو کرتے ہوئے دیکھا۔تو ان کی طبیعت پر بھی اثر پڑا۔تو فوراً یہ بھی کرنے لگ گئے۔

دین اللہ کا رنگ ہے:

اس لیے فرمایا کرتے تھے۔ کہ دین ایک رنگ ہے۔اور اللہ رنگ ساز ہے۔یعنی یہ دین اللہ نے بنایا ہے۔اور علماء رنگ فروش ہیں۔ مسئلہ ان سے معلوم ہوتا ہے۔لیکن مخلصین، اللہ والے، جو زندگی کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں، اولیاء اللہ، ان کی مثال رنگ ریز کی ہے۔ کہ جب تک انسان ان کی صحبت اختیار نہ کرے۔ ان کے پاس نہ رہے۔ دین کا رنگ نہیں چڑھتا۔مسئلے یاد ہو جاتے ہیں۔لیکن دین کا رنگ چڑھے اور انسان کی عملی زندگی اس کے مطابق ہو جائے۔ یہ اکثر وبیشتر اہل اللہ، اولیاء اللہ، نیک لوگ، مخلصین، جن کو صادقین کہا جاتا ہے۔ان لوگوں کی رفاقت اختیار کرنے کے ساتھ انسان

پہ دین کا رنگ چڑھتا ہے۔ اور فائدہ تبھی ہوتا ہے۔ جب دین کا رنگ چڑھا ہوا ہو۔ جب رنگ نہ چڑھا ہوا ہو۔ تو صرف باتوں سے کام نہیں بنا کرتا۔ تو اس لیے صادقین کی معیت، ان کی رفاقت بہت ضروری ہے۔ جتنا وقت ان کے پاس انسان گذارتا ہے۔ اتنا اس کے اوپر صدق واخلاص کا اثر پڑتا ہے۔ اور انسان کی زندگی میں انقلاب آتا ہے۔

اولیاء کی زیارت بھی باعث برکت:

بلکہ یوں کہیے۔ کہ جہاں تک اللہ کے مخلص اور پیارے بندوں کا تعلق ہے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔ اس کا تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن شرعی نقطہ نظر سے ان کا دیکھ لینا، انکی زیارت کر لینا یہ بھی انسان کے اوپر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ اس سے بھی انسان کو ایک نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس لیے پرانے زمانے سے اہل اسلام کے اندر یہ ذوق چلا آ [illegible] نے فلاں بزرگ کو دیکھا ہوا ہے۔ میں نے فلاں بزرگ کی زیارت کی ہے۔ لوگ اس چیز کو اپنے لیے شرف سمجھا کرتے تھے۔ کہ ہم نے اتنے بزرگوں کی زیارت کی ہے۔ امت کے اندر بطور ورثے کے یہ چیز چلی آ رہی تھی۔

لیکن آج ہمارے حالات اس طرح کے ہو گئے کہ ہم اس قسم کے دھندوں میں لگ گئے کہ جو چیز باعث فضیلت تھی۔ جس کے ساتھ انسان کو کمال حاصل ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمارے ذہنوں سے بالکل نکل گئی۔ اب تو طالب علموں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں ہے۔ کہ کسی بزرگ کی زیارت انسان کیلئے سعادت کی بات ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد آپ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے۔ اور انسان کو جو صحابیت کا شرف ملتا ہے۔ تو صحابیت کا دارومدار صرف رؤیت پہ ہے۔ صحابی کسے کہتے ہیں؟۔ جس نے ایمان کی حالت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت وعقیدت کے ساتھ ایک دفعہ دیکھ لیا۔ صحابی بن گیا۔ نہ کوئی بات سننی ضروری ہے۔ نہ کوئی روایت ضروری ہے۔ ایمان کی حالت میں عقیدت ومحبت کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر

ایک نظر ڈال لی جائے۔اور یہ رؤیت حاصل ہو جائے۔تو اس رؤیت کے حاصل ہونے سے شرف صحابیت حاصل ہو گیا۔

زیارت کی فضیلت حدیث سے:

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے کے ساتھ بھی انسان کو شرف حاصل ہوتا ہے۔ دیکھیں! صرف رؤیت پر صحابیت کا درجہ مل گیا۔اور پھر یہ بات کوئی نبی کے ساتھ خاص نہیں۔ کہ آپ کہیں۔ یہ تو حضور ﷺ کی خصوصیت ہے۔نہیں۔ بلکہ خود حدیث شریف میں تعمیم ہے۔فضائل صحابہ میں یہ روایت آتی ہے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا کہ لوگ جہاد پہ نکلیں گے۔تو تلاش کریں گے۔کہ کوئی ایسا آدمی ہمارے اندر ہے۔

﴿مَن رَاٰی النَّبِیَّ ﷺ﴾

جس نے حضور ﷺ کو دیکھا ہو۔یعنی صحابی ہو۔آپ فرماتے ہیں کہ وہ شخص موجود ہو گا۔تو اللہ اس کی برکت سے انہیں فتح دے گا۔

پھر ایک وقت آئے گا، کہ لوگ کہیں گے۔کہ کیا ایسا کوئی آدمی ہے۔

﴿مَن رَاٰی مَن رَاٰی النَّبِیَّ ﷺ﴾

جس نے اس کو دیکھا ہو جس نے حضور ﷺ کو دیکھا ہو۔یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کو جس نے دیکھا ہو۔تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھنے کے ساتھ تابعین کو یہ شرف حاصل ہو گیا۔پھر فرمایا کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا۔کہ لوگ پوچھا کریں گے۔کہ کیا کوئی شخص ایسا ہے۔ جس نے اس شخص کو دیکھا ہو جس نے ایسے شخص کو دیکھا ہو جس نے حضور کو دیکھا ہے۔ یعنی حضور ﷺ کے دیکھنے والے کو دیکھنے والے کی زیارت کی ہو۔یعنی تبع تابعی ہو۔

تو تین تین درجے، اور میرا خیال ہے کہ کسی روایت کے اندر چوتھے درجے کا ذکر بھی ہے۔ (مسلم ۲/۳۰۷۔مشکوۃ ۲/۵۵۳)

مسلسل بالرؤیت حدیث:

اور جو روایتیں مسلسلات آئی ہوئی ہیں۔آپ حضرات کے علم میں ابھی بات نہیں آئی ہوگی۔کہ حضور صلی اللہ علیہ سلم سے بعض باتیں ایک کیفیت کے ساتھ مسلسل چلی آتی ہیں۔ان میں ''مسلسل بالرؤیة'' بھی ہے جس کی ہمیں اجازت ہے۔

میں نے اپنے استاذ کو دیکھا۔اس نے اپنے استاذ کو دیکھا۔اس نے اپنے استاذ کو دیکھا۔اسی طرح چلتے چلتے اسی رؤیت کا ذکر سرور کائنات ﷺ تک پہنچ جاتا ہے اور اس سند سے یہ روایت ہے۔آپ ﷺ فرماتے ہیں۔

- جس نے مجھے دیکھا
- یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا۔
- یا اس دیکھنے والے کو دیکھا۔

''اِلیٰ یوم القیامة'' تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کی بخشش کرے گا۔یہ مسلسل بالرؤیۃ روایت ہے۔دیکھنے پر اس کو یہ فضیلت حاصل ہے۔تو دوسرے کو دیکھنے کے ساتھ بھی ایک قسم کی نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔اور اس نسبت کے حاصل ہونے سے بھی شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

حضرات رائے پوری رحمہ اللہ کی صحبت کا اثر:

ہمارے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کی سوانح میں بھی شاید ہے۔ورنہ یہ بات میں نے زبانی سنی ہوئی۔کہ حضرت مولانا رائے پوری رحمہ اللہ جب پڑھ کے فارغ ہوئے۔تو ان کا خیال ہوا۔کہ اب کسی اللہ والے کے ساتھ رابطہ لگانا چاہیے۔تو ان دنوں میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ حیات تھے۔تو یہ ان کی خانقاہ میں گنگوہ پہنچ گئے۔کہتے ہیں وہاں جا کے ہم نے دیکھا۔کہ پورے ہندوستان کے چوٹی کے علماء بڑے بڑے جتنے بھی تھے۔وہ سب حضرت کے اردگرد تھے۔تو ہم نے خیال کیا۔کہ یہاں ہم جیسے طالب علموں کو کون پوچھے گا؟۔ہم تو یہاں تعلق قائم نہیں کرتے۔یہاں تو بہت

بڑے بڑے علماء میں۔ ہماری یہاں بات نہیں پوچھی جائے گی۔ تو ہم حضرت کے خلفاء میں سے کسی کے پاس جائیں گے۔ تو ان کا رابطہ ہو گیا۔ حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے۔ جن کی خانقاہ رائے پور میں تھی۔ تو حضرت ان کے پاس گئے۔ اور دو چار دن گذارے۔ بیعت ہوئے۔ اور کوئی وظیفہ انہوں نے پڑھنے کیلئے بتا دیا۔ تو گھر آگئے۔ حضرت کا گھر سرگودھے کے قریب ہے۔ ڈھڈیاں اور ڈھڈیاں کے پاس ہے بھیرا۔ اور بھیرے کا تھا۔ وہ نور الدین جو غلام احمد قادیانی کا خلیفہ بنا تھا۔ خلیفہ اول، اور یہ نور الدین حکیم تھا۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا سارا خاندان جب کبھی بیمار ہوتا تو علاج اسی سے کرواتے تھے۔ یہ ان کا خاندانی طبیب تھا۔ تو شاید غالباً حضرت کے چچا بیمار ہو گئے۔ علاج کے سلسلے میں جب نور الدین کا پتہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ قادیان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ تو حضرت کہتے ہیں کہ ہم اپنے مریض کو لے کے قادیان چلے گئے۔ جب قادیان گئے تو نور الدین وہاں موجود تھا۔ تو علاج کے سلسلے میں وہاں سات آٹھ دن ٹھہرنے کا موقع ملا۔

تو کہتے ہیں۔ کہ مرزا تو فوت ہو چکا تھا۔ اس وقت یہی نور الدین خلیفہ تھا۔ تو ان کے حالات دیکھ کے۔ لوگ وقتی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ کہ یہ اتنا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں اثر معلوم ہوتا تھا۔ یہ ابھی تازہ مدرسے سے فارغ ہو کے گئے تھے۔ کہتے ہیں۔ کہ ایک جگہ جا کے طبیعت رک جاتی تھی۔ کہ وہ کہتے کہ جو ہمارا طریقہ ہے۔ یعنی غلام احمد کو نبی مان کر چلنے کا جو طریقہ ہے۔ یہی طریقہ حق ہے۔ جو لوگ اس رستے پہ نہیں چل رہے۔ وہ جہنمی ہیں، کافر ہیں، وہ آخرت میں جہنم میں جائیں گے۔

جب یہ بات سامنے آتی۔ تو فوراً میرے ذہن میں یہ بات آتی۔ کہ جس شخص کو میں دیکھ کے آیا ہو۔ یعنی مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری وہ شخص تو گمراہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق تو ایسی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ کہ وہ کسی غلط رستے پہ ہے۔

یعنی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی دو چار دن کی ملاقات اور انکی زیارت اور رؤیت ایمان کے لیے محافظ بن گئی۔ کہ طالب علمی کا زمانہ بھی قریب قریب تھا۔ عقل و ہوش ابھی کامل نہیں تھی۔ ان کی باتیں اثر انداز نہ ہوسکیں۔ اس لیے کہ دو چار دن حضرت کی خدمت میں گذار آئے تھے۔

تو ایسے واقعات آپ کے سامنے آئیں گے جہاں پتہ چلے گا۔ کہ کسی اللہ کے ولی کے پاس جانے سے اور اس کی رؤیت سے، اس کی زیارت کرنے سے انسان کا ایمان محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور شیطان کے حملوں سے انسان بچ جاتا ہے۔ یہ رؤیت اور صحبت کی برکت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اس قسم کے اثرات رکھے ہیں۔ تو صرف رؤیت بھی بہت بڑی سعادت ہے۔ باقی اگر صحبت نصیب ہو جائے پھر تو کہنا ہی کیا؟۔

صحبت کی اہمیت مولانا رومی کی زبانی:

مولانا رومی رحمہ اللہ کا قول عام طور پر لوگ نقل کیا کرتے ہیں۔ وعظوں میں، نصیحتوں میں، کہ مولانا رومی کہتے ہیں۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء
صحبت صالح اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد وطاعت است

تیرا ایک زمانہ، کچھ دیر کسی اللہ کے ولی کی صحبت میں بیٹھ جانا، بے ریاء سو سال تک بھی عبادت کرتے رہو۔ تو بسا اوقات ایک ساعت اس کے مقابلے میں بہتر ہوتی ہے۔ نیک صحبت اگر ایک ساعت بھی ہو تو سو سالہ زہد وطاعت کے مقابلے میں بہتر ہے۔ یہ مولانا رومی کا قول ہے۔

ایک اشکال کا بہترین جواب:

لیکن طالب علمانہ طور پر آپ کے سامنے ایک بات آسکتی ہے۔ کہ یہ تو بلا وجہ ایک مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ سو سال کی زہد وطاعت اور ادھر کسی ولی کی صحبت میں ایک ساعت۔ تو یہ ایک ساعت ان سو سالوں سے افضل کیسے ہوسکتی ہے؟۔ یہ طالب علمانہ طور پر آپ کے ذہن میں اشکال آسکتا ہے۔

اس اشکال کا حل یہ ہے۔ کہ یہاں سے ہر ساعت مراد نہیں کہ آپ گئے اور چند لمحے وہاں بیٹھ گئے۔ اور آپ کی یہ ساعت سو سالہ زہد وطاعت کے مقابلے میں افضل ہو جائے ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ایک بات کو سمجھیے۔ کہ ایک ہے انسان کا ظاہری عمل اور ایک ہے انسان کے باطن کی اصلاح، بسا اوقات ظاہری عمل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن باطن کے ایک جذبے کی وجہ سے ظاہری عمل بے کار چلا جاتا ہے۔

انسان کے طور پر عقیدہ ٹھیک نہیں۔ اور ظاہری طور پر عمل بہت زیادہ ہے۔ لیکن جب عقیدہ ٹھیک نہیں تو ظاہری عمل کا کیا اعتبار؟۔ اب اگر ایک آدمی ساری رات کھڑا نفل پڑھتا رہے۔ اور منہ اس کا مشرق کی طرف ہو۔ قبلے کی طرف منہ نہ ہو۔ تو ساری رات مشقت اٹھانے سے اسے کیا ملے گا؟۔ جب اس کا رخ ہی سیدھا نہیں ہے۔ اسی طرح سے ایک آدمی عبادت وریاضت تو بہت کرتا ہے۔ لیکن اس کے دل کے اندر حسد ہے۔ اس کے دل کے اندر تکبر ہے۔ اس کے دل میں اس قسم کے جذبات ہیں۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے۔ جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ (مشکوۃ ا/ ۴۲۸۔ ابو داود ۲/ ۶۳)

تو دل کے اندر ایسی بیماری ہے۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے۔ ظاہری زہد وتقویٰ جتنا بھی وہ کرلے۔ اس اخلاقی خرابی کے مقابلے میں سارا بے کار ہے۔

اور اللہ کے ولی کے پاس بیٹھ کر بسا اوقات انسان کے قلب کی حالت بدل جاتی ہے۔ اور وہ چیز جس کے ساتھ انسان کی عبادت ضائع ہو رہی تھی۔ وہ چھوٹ جاتی ہے۔

تو وہ ساعت جس کے اندر دل میں تبدیلی آجائے، دل کا رخ بدل جائے، وہ ساعت سوسالہ عبادت کے مقابلے میں افضل ہے۔ ہر ساعت اس سے مراد نہیں ہے۔

تو یہ ساعت سوسالہ عبادت سے افضل ہے۔ عبادت سے مراد وہ عبادت ہے جو ظاہری طور پر آپ کو عبادت نظر آتی ہے۔ لیکن باطن کی خرابی کی بناء پر وہ عبادت نہیں۔ بلکہ ایک ظاہری حرکات ہیں۔ اور جب باطن میں تبدیلی آجاتی ہے۔ تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور عبادت ساری کی ساری قابل قبول ہو جاتی ہے۔

تو ایک ساعت میں انسان کے قلب کی حالت کا بدل جانا بسا اوقات سو سال اپنے طور پر انسان عبادت کرتا ہے۔ تو اتنی تبدیلی قلب میں نہیں آتی۔ جتنی صحبت میں بیٹھ کے تبدیلی آجاتی ہے۔

صحبت کب مفید ہوتی ہے؟:

لیکن اس کے ساتھ ایک بات کو ضرور یاد رکھیے۔ صحبت مفید کب ہوتی ہے؟۔ ساتھ رہنا مفید کب ہوتا ہے؟۔ صحبت مفید تب ہوتی ہے۔ جب صدقِ دل کے ساتھ انسان محبت اور عظمت بھی دل میں لائے۔ اگر صدقِ دل کے ساتھ دل میں محبت اور عظمت نہیں تو پھر ساتھ رہنے سے کبھی بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا۔ پھر سو سال بھی ساتھ رہو گے تو اثر نہیں پڑے گا۔ تو صحبت مؤثر تب ہوتی ہے جب انسان کے دل کے اندر محبت اور عظمت پیدا ہو جائے۔

محبت اور عظمت کے بغیر تو آپ کو معلوم ہے۔ ابوجہل مکہ معظمہ میں تھا۔ اور ۵۳ سال حضور ﷺ کو بیداری میں دیکھتا رہا۔ لیکن اس نے کیا فائدہ اٹھایا؟۔ جب دل میں محبت نہیں آئی۔ جب دل میں عظمت نہیں آئی اور ایمان نہیں لایا۔ تو بیداری میں بھی دیکھتا رہا تو کوئی اثر نہیں اور اگر دل میں محبت اور عظمت آگئی تو وحشی بن حرب جیسا شخص۔ ایک نظر ڈالی۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب میرے سامنے نہ آنا

(بخاری ۲/ ۵۸۷)

وہ ایک نظر ان کو کہیں سے کہیں پہنچا گئی۔ فرق یہ ہے کہ وحشی کی ایک نظر محبت وعظمت کے ساتھ تھی۔ ابوجہل کی ۵۳ سالہ صحبت بغیر محبت وعظمت کے تھی۔ اس لیے اس ساتھ رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

تو اثرات تب واقع ہوا کرتے ہیں۔ جب انسان دوسرے کو محبت وعظمت کے ساتھ دیکھتا ہے۔ پہلے اپنے کسی بڑے کے ساتھ تعلق پیدا کر کے اس کی محبت اپنے دل میں لاؤ۔ اس کی عظمت اپنے دل میں پیدا کرو۔ عقیدت ومحبت کے ساتھ پھر اس کے ساتھ بیٹھو۔ پھر طبیعت طبیعت سے چوری کرتی ہے۔ وہی عادت اختیار کرے گی۔ جس کی صحبت میں انسان بیٹھتا ہے۔

اچھی اور بری صحبت کی مثال:

سرور کائنات ﷺ نے اسی کو مثال دے کے سمجھایا کہ اچھی صحبت کی مثال ایسے ہے جیسے آپ کسی عطر فروش کی دکان پر بیٹھ جائیں۔ اگر آپ عطر فروش کی دکان پہ بیٹھیں گے۔ تو اول تو آپ کے دل میں شوق پیدا ہوگا۔ اور آپ اس سے خود عطر خرید لو گے۔ تو خوشبو آپ کو حاصل ہو جائے گی۔ اور کبھی ایسے بھی ہوتا ہے۔ کہ عطر فروشوں کی عادت ہوتی ہے۔ کہ جو آئے اس کو خوشبو لگا دیتے ہیں۔ بغیر کسی پیسے کے تو یا اس طرح آپ کو خوشبو لگ جائے گی۔

اور اگر نہ پیسوں سے خریدیں، نہ ویسے وہ لگائے۔ تو جتنی دیر وہاں بیٹھو گے۔ کم از کم دماغ معطر رہے گا۔ خوشبو آتی رہے گی۔ دل ودماغ میں بشاشت رہے گی۔ محروم پھر بھی نہ رہے۔

ایسے ہی جس وقت انسان کسی صحبت میں بیٹھا ہے، یا تو کوئی عادت پسند آجائے گی۔ تو انسان کوشش کر کے اس عادت کو اپنا لے گا۔ یہ تو ایسے ہے جیسے آپ نے پیسوں سے خوشبو خرید لی۔ اور کبھی ایسے بھی ہوتا ہے۔ کہ اس کو دیکھتے دیکھتے خود ہی عادت پڑ جائے گی۔ یہ ایسے ہے جیسے مفت خوشبو حاصل ہو گئی۔

ورنہ اگر آپ کچھ اور نہ کریں۔ تو جب تک آپ ایک اچھے ماحول میں بیٹھیں گے تو کم از کم

- آنکھ بھی محفوظ رہے گی۔
- کان بھی محفوظ رہے گا۔
- دل بھی محفوظ رہے گا۔
- دماغ بھی محفوظ رہے گا۔
- نیکی کی ہوا ہوگی۔
- نیکی کی فضاء ہوگی۔
- برائی سے بچے رہیں گے۔
- تو یہ فائدہ بھی کم نہیں ہے۔

اور بری صحبت کیلئے مثال یوں دی۔ کہ جیسے کسی بھٹی والے کے پاس جاؤ۔ تو اول تو کوئی شعلہ اٹھے گا۔ آپ کے کپڑے جلا دے گا۔ اور آپ کو نقصان پہنچے گا۔ یہاں بھی بری عادت آپ نے اختیار کر لی تو وہی آپ کے لیے بربادی کا باعث بن جائے گی۔ اور اگر آپ نے بری عادت نہ بھی اختیار کی۔ تو جتنی دیر تک آپ وہاں بیٹھے رہیں گے تو دھوئیں کے ساتھ دماغ تو پریشان ہوگا۔ تو وہاں بیٹھنے کے ساتھ نقصان ہی نقصان ہے۔ فائدہ کسی قسم کا نہیں ہے۔ (بخاری ۸۳۰/۲۔ مسلم ۳۳۰/۲۔ مشکوۃ ۴۲۶)

بری دوستی کا نقصان قیامت کے دن:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بیان فرمایا

"اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ"

(سورہ زخرف آیت ۶۷)

قیامت کے دن سارے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ سوائے ان

لوگوں کے جو متقی ہیں۔ متقیوں کے ساتھ دوستی ہو گی تو آخرت میں بھی کام آئے گی۔ اور اگر غیرِ متقیوں کے ساتھ دوستی ہو گی۔ تو پھر قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے۔ تم نے یہ برا کام کیوں کیا تھا۔ وہ کہے گا کہ جی! فلانے دوست نے مجھ سے کروایا تھا۔

دوست دوست کو پھنسائے گا۔ دوست دوست کی شکایت کرے گا۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا اظہار کریں گے۔ اور متقی ایک دوسرے کے لیے سہارا بنیں گے۔ دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔

برے دوست کی صحبت سے انسان کا جو نقصان ہوتا ہے۔ اس کا قرآن کریم نے ذکر کیا۔

﴿يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا. يَا وَيْلَتَا لَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾

(سورہ فرقان آیت ۲۸)

قیامت کے دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ اور کہے گا، اے کاش! کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اللہ کے رسول کا ساتھ دیتا۔ اور میں فلانے کو دوست نہ بناتا۔ اس کا ساتھ نہ دیتا۔ یہ چیخے گا وہ شخص جس نے برے کے ساتھ دوستی لگائی، اور دوستی کی وجہ سے برائی میں مبتلا ہوا۔ پھر کہے گا۔ کاش! میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ ہوتا۔ جتنا مشرق اور مغرب کے درمیان میں ہے۔ لیکن اس وقت چیخنے، چلانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ جو بربادی ہونی تھی وہ ہو گئی۔

برا دوست برے سانپ سے برا:

جیسے مولانا رومی کہتے ہیں۔

یار بد بدتر بود از مار بد

برا دوست برے سانپ سے بھی بدتر ہے۔ برے سانپ سے مراد ہے زہریلا

سانپ۔ اگر دنیا کے اندر انسان کو زہریلا سانپ کاٹ لے تو انسان کا کیا نقصان ہو گا؟۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مر جائے گا۔ اور یہ مرنا ایک ایسی چیز ہے کہ سانپ بھی کاٹے تو بھی مرنا ہے۔ جتنے لوگ مرتے ہیں سارے سانپ کے کاٹنے سے تو نہیں مرتے۔ بغیر سانپ کے کاٹنے سے بھی مرتے ہیں۔ تو زیادہ سے زیادہ انسان مر جائے گا اور مرنا ویسے بھی ہے۔ لیکن سانپ کے کاٹنے سے جو شخص مر گیا۔ وہ آخرت میں چیخے گا نہیں۔ کہ مجھے سانپ نے کیوں کاٹا تھا؟۔ میں سانپ کے کاٹنے سے کیوں مر گیا۔؟ آخرت میں اس کو پچھتاوا نہیں ہوگا۔

لیکن برا دوست۔ اگر اس کی وجہ سے آپ نے کوئی بری عادت اختیار کر لی۔ تو آپ دنیا میں بھی برباد ہوتے ہیں۔ اور آخرت میں بھی چیخیں گے۔ کہ کاش! اس کے ساتھ میرے دوستی نہ ہوتی۔ اور اس کی صحبت کی وجہ سے میں کوئی برائی اختیار نہ کرتا۔

ابھی بھی وقت ہے:

یہ ساری کی ساری باتیں آپ کے سامنے اس لیے کی جاتی ہیں۔ یہ عمر آپ لوگوں کی ایک دوسرے سے اثر لینے کی ہے۔ اس میں ہمیشہ سوچ کے دوست بناؤ۔ یہاں رہتے ہوئے بھی، گھر میں جا کر بھی۔ اچھا ماحول اختیار کرو، اچھے لوگوں کے ساتھ رہو، تا کہ آپ کی طبیعت کے اوپر اچھے اثرات واقع ہوں۔ کسی بری مجلس میں نہ بیٹھو۔

خاص طور پر جس چیز سے احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ وہی آنکھ سے تعلق رکھنے والی بات، آج ہماری بدنصیبی ہے کہ گھر گھر ٹی وی آ گیا۔ وی سی آر گیا۔ پہلے لوگ سینما دیکھنے کیلئے دور دور جایا کرتے تھے۔ اب گھر گھر سینما ہو گیا۔ گھر گھر فلمیں ہیں۔ اور وہ آنکھ کے ساتھ دیکھنے کی چیز ہے۔ تو جس وقت آپ ٹی وی دیکھیں گے۔ یا فلم دیکھیں گے۔ اس کے اثرات طبیعت کے اوپر اتنے زیادہ واقع ہوتے ہیں۔ کہ جس کی حد نہیں۔ کیونکہ آنکھ سے آپ نے وہ شکلیں بھی دیکھیں، کان کے ساتھ ان کی باتیں بھی سنیں، تو کان بھی مصروف اور آنکھ بھی مصروف۔ تو دل، دماغ کی بربادی، حیا اور غیرت کا جنازہ

جتنا اس کے ساتھ نکلتا ہے۔ آج کل اس سے زیادہ کسی چیز سے بربادی نہیں آتی۔

گھر کے ماحول کا اثر:

چھوٹے چھوٹے بچے ماں کی گود میں بیٹھے ہوئے۔ جس وقت ٹی وی دیکھتے ہیں۔ اور ماں بھی ٹی وی پر فلم دیکھ رہی ہو۔ اس وقت سے گندے اثرات مزاج پر پڑنے شروع ہوتے ہیں۔ ہر وقت ناچنا ہوا دیکھتے ہیں۔ تو بچے ویسے ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی قسم کے گیت یاد کر لیتے ہیں۔ اور اسی قسم کی باتیں اپنی زبان سے اداء کرتے ہیں۔ تو یہ قوم کی غیرت کا جنازہ جو نکلتا جا رہا ہے۔ وہ سارے کا سارا اسی ٹی وی اور وی سی آر کا اثر ہے۔

اور اس میں جو تھوڑی بہت کمی وہ رہ جائے وہ فلمی رسالے پوری کر دیتے ہیں۔ یہ فلمی رسالے۔ ڈائجسٹ اور ہفتہ وار جو ایڈیشن آتے ہیں جن میں اس قسم کی تصویریں آتی ہیں۔

جو شخص

- ٹی وی دیکھے گا۔
- فلمیں دیکھے گا۔
- گانے سنے گا۔
- تصویریں دیکھے گا۔
- اور اس قسم کا لٹریچر پڑھے گا۔

وہ ایسے جیسے وہ کسی گندے ماحول کے اندر بیٹھا ہوا ہو۔ اور سارے کے سارے گندے اثرات اس کے اوپر واقع ہوتے ہیں۔

اس لیے گھروں کے ماحول کو سدھارنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ کہ گھروں کے اندر ٹی وی نہ آئے۔ گھر کے اندر بچے فلمیں نہ دیکھیں۔ اور ان میں یہ عادت نہ ڈالی جائے۔ یہ بچوں کے والدین کی بھی ذمہ داری ہے۔ اور آپ حضرات کو تو ہم اسی طرح

سے سمجھائیں گے۔ کہ آپ جب گھر جائیں تو ان جیسی چیزوں سے لازماً بچیں۔ اور اپنے دوسرے بہن بھائیوں کو بھی بچانے کی کوشش کریں۔ تب جا کے اسلامی حیاء کچھ باقی رہ سکتی ہے۔ اور کچھ اخلاق بچ سکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ پر دین کا رنگ غالب آجائے تو ان فسق و فجور کی چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔

- آنکھ کی بھی حفاظت کرو۔
- کان کی بھی حفاظت کرو۔
- زبان کی بھی حفاظت کرو۔
- دل کی بھی حفاظت کرو۔
- دماغ کی بھی حفاظت کرو۔
- ظاہر کی بھی حفاظت کرو۔
- باطن کی بھی حفاظت کرو۔

اور اچھے ماحول میں رہنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی توفیق دے کہ ہم اپنے اردگرد اچھا ماحول بنائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

سوال : آپ نے فرمایا کہ صحابی وہ ہے جس نے حضور ﷺ کو دیکھا ہو۔ کیا نابینا آدمی بھی صحابی بن سکتا ہے؟۔ حالانکہ وہ دیکھتا نہیں۔

جواب: نابینا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ضابطہ جو ذکر کیا جاتا ہے۔ اکثر کی طرف دیکھ کے کیا جاتا ہے۔ نابینے کا حضور ﷺ کی صحبت میں بیٹھ جانا اور حضور ﷺ کا اس کے اوپر نظر ڈال لینا۔ یہ اس کو شرف صحابیت سے نواز دیتا ہے۔ اس لیے علامہ ابن حجر نے صحابی کی جو تعریف نخبۃ الفکر میں کی ہے وہ جامع ہے۔ کہ

''صحابی وہ شخص ہے۔ جس نے ایمان کی حالت میں سرورِ کائنات ﷺ کو دیکھا ہو یا آپ کی مجلس میں بیٹھا ہو''۔

تو مجلس کا لفظ اس لیے بڑھایا ہے تاکہ یہ تعریف نابینوں کو بھی شامل ہو جائے۔
بہر حال اگر اس نے دیکھ لیا تو بھی ٹھیک۔ اور اگر حضور ﷺ کی نظر اس پہ پڑ گئی تو بھی رابطہ قائم ہو گیا۔

سوال: حضرت لدھیانوی رحمہ اللہ کا مختصر تعارف کرا دیں اور ان کے لیے خصوصی مغفرت کی دعا کریں۔

جواب: درجات کی بلندی کیلئے دعا تو اس دن سے ہی کر رہے ہیں۔ اجتماعی طور پر کوئی ضروری نہیں ہوتا۔ بہر حال آج بھی کریں گے۔ باقی ان کے مختصر حالات رسالوں اور اخباروں میں آ رہے ہیں۔ اس وقت کوئی وعظ اور تقریر مقصود نہیں ہوا کرتی۔ آپ کے فائدے کیلئے آپ کو بات سمجھانی مقصود ہوتی ہے۔
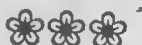
دعا کی اہمیت

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ. (سورۃ غافر آیت ۶۰)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

تمہید

آپ حضرات کے علم میں آگیا ہوگا کہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور اس کے فضل وکرم سے میرے لیے سفر حجاز کے اسباب مہیا ہوئے ہیں اور اگلے ہفتے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سفر حج پر کراچی سے روانہ ہونگا۔ اور آج شام کو میں یہاں سے کراچی جارہا ہوں۔

میرے لئے ایک بہت بڑی سعادت ہے اور آپ سب میرے ساتھ اس خوشی میں شریک ہیں۔ میں کل سے سوچ رہا تھا کہ اپنے برخورداروں سے آخری ملاقات کی کوئی صورت بنالوں، کوئی تھوڑا سا گفتگو کا موقع مل جائے۔ لیکن کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی تھی کہ میں کیا کہوں؟

کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے تصور سے دل ودماغ کے اوپر دباؤ بھی اتنا ہے کہ کوئی بات ایسی زبان سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ جس میں کوئی بھی تعریفی پہلو ہو یا کوئی اس میں مفاخرت کا شائبہ ہو۔ میں اس تصور کے نیچے بہت دبا ہوا تھا۔ اس لیے بات کرنے کی جرأت نہیں ہورہی تھی۔

لیکن آج ہمارے مفتی ظفر اقبال صاحب (ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ باب العلوم) نے بہت اصرار کیا کہ نہیں.... کوئی چار پانچ منٹ ہی سہی ...... ذرا ایک مجلس ہو جانی چاہیے۔ تو ان کے اصرار کرنے پر اپنے آپ کو بہت سوچ سوچ کر تیار کیا کہ چلو اس ضمن میں ایک مفید بات آپ کو بتادوں۔ وہ مفید بات ہے دعا کی اہمیت۔

زیارت حرمین شریفین کی امنگ:

جس وقت میں سکول کو چھوڑ کر عربی مدرسے کی طرف آیا تھا۔ تو قدرتی طور پر حرمین شریفین کے ساتھ تعلق چونکہ ایمان کا تقاضا ہے۔ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو ایمان کے ساتھ ساتھ اس کو مکہ اور مدینہ کا تصور لازماً آتا ہے۔

مکہ کا تصور اس لیے آتا ہے کہ ایمان کے بعد ہم نے سب سے اہم کام جو کرنا ہے۔ ایمان کے بعد سب سے ضروری چیز نماز کا پڑھنا ہے۔ نماز ایمان اور کفر کے درمیان ایک فاصل ہے بعض آئمہ کے نزدیک جان بوجھ کر نماز نہ پڑھنے والا کافر ہے۔ اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ تو جب ایک شخص نماز پڑھتا ہے تو قبلے کی طرف منہ کرتا ہے اور بچے بھی جانتے ہیں کہ ہمارا قبلہ، کعبہ مکہ میں ہے۔ جس کو ہم اللہ کا گھر کہتے ہیں۔ بیت کی نسبت اللہ کی طرف جیسی بھی ہے عظمت کیلئے ہے یا تشریف کیلئے ہے۔ بہر حال ہم اس کو بیت اللہ کہتے ہیں۔ وہ اللہ کا گھر ہے۔

اور ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول کی نسبت سے تو لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ لازم ہے۔ اور محمد رسول اللہ سے جب تعلق ہوتا ہے تو مدینہ یاد آتا ہے کہ مدینہ جو ہے یہ مدینۃ الرسول ہے، روضۃ الرسول ہے۔ یہاں بیت اللہ ہے تو وہاں بیت الرسول ہے۔ تو مؤمن ہونے کے بعد دونوں کے ساتھ تعلق ہونا ایک طبعی امر ہے۔ آپ لوگ چونکہ مدرسوں میں رہتے ہیں چھوٹے بچے یہ بھی مدینہ اور مکہ کا ذکر سنتے ہیں تو لازماً ان کے دل میں بھی خیال آتا ہے

- اللہ کا گھر بھی دیکھنا چاہیے۔
- اللہ کے رسول کا گھر بھی دیکھنا چاہیے۔
- بیت اللہ کے پاس بھی جانا چاہیے۔
- بیت الرسول کے پاس بھی جانا چاہیے۔

یہ شوق ابھرتا ہے۔ تو ایسے ہی عربی مدرسے میں آتے ہی دل کے اندر یہ ایک امنگ پید اہوئی کہ حرمین شریفین کی زیارت اللہ کروائے یہ ایک بہت بڑی سعادت ہے۔ دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی۔ تو ساتھ یہ خیال بھی آتا تھا کہ یہ بات ہمارے لیے کیسے ممکن ہے؟۔

- غربت ہے۔

- مسافرت ہے۔
- ابھی ابھی ہندوستان سے اجڑ کر آئے ہیں۔
- یہاں معاشی حالت بھی ٹھیک نہیں۔
- مہینے کا خرچ تو گھر سے ملتا نہیں۔

یہ تو اتنا لمبا سفر ہے۔تو حرمین شریفین میں کیسے جائیں گے؟

یہ نعمت تو جنت میں بھی نہیں ملے گی:

لیکن اس دل کی تڑپ کی بناء پر میں نے دعا طالب علمی کے ابتدائی دور سے ہی شروع کی تھی تو دعا میں اس طرح کیا کرتا تھا۔

"یا اللہ حرمین شریفین کی زیارت کروادے۔ یہ نعمت ایک ایسی ہے جو جنت میں بھی نہیں ملے گی"۔

بات سمجھ رہے ہو؟۔اب جنت میں جانے کے بعد اگر آپ کہیں کہ بیت اللہ کو دیکھ لیں تو کیسے دیکھیں گے؟ آپ مکہ معظمہ کی گلیوں میں گھوم پھر کر دیکھ لیں کیسے دیکھیں گے؟

- آپ مدینہ منورہ کی گلیاں دیکھ لیں۔
- حضور ﷺ کے آثار دیکھ لیں
- بدر کا میدان دیکھ لیں۔
- احد کا میدان دیکھ لیں۔

جہاں پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خون بہا ہے۔تو آپ جنت میں کیسے دیکھیں گے؟ ایسے دل میں خیال آتا۔ جیسے طالب علم اوٹ پٹانگ مارتے ہیں، ہم بھی اوٹ پٹانگ مارتے تھے کہ یا اللہ! یہ نعمت تو ایسی ہے جو جنت میں بھی نہیں ملے گی۔ یہ تو دنیا میں نصیب فرمادے پھر وہی بات آتی کہ پلے تو کچھ بھی نہیں ہے مگر ارادے اور خواہش اتنی لمبی لمبی۔تو یہ کیسے پوری ہوں گی۔

زیارتِ حرمین کا شوق

اس کے باوجود بھی دعا کرتے رہے۔ پھر دعا میں یہ ساتھ ساتھ اضافہ ہو گیا کہ یا اللہ! ہم تو بے بس ہیں لیکن تیرے خزانے میں تو کوئی کمی نہیں۔ تیرے پاس تو سب کچھ ہے تو اگر کسی کیلئے اسباب مہیا کر دے تو تیرے لیے کیا بعید ہے۔ تیرے فیصلے جو ہیں (یہ بات یاد رکھنا میری) میں اللہ تعالیٰ کے جناب میں ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا تھا۔ کہ

یا اللہ! تیرے فیصلے اسباب کے محتاج نہیں بلکہ اسباب تیری تخلیق کے محتاج ہیں۔ تیرے فیصلے اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب تیری تخلیق کے محتاج ہیں۔ تو چاہے تو کسی کے لئے سبب پیدا کر دے۔ تو چاہے تو نہ کرے۔ اسباب پیدا ہوتے ہی تیری تخلیق کے ساتھ ہیں۔ تیرے فیصلے اسباب کے تابع نہیں ہیں۔ بہت دل لگا کر دعا کرتا اور جب حاجیوں کا وقت آتا۔ آنے کا اور جانے کا۔ تو اس وقت دل کے اندر اور ہوس اٹھتی۔

دعا کی قبولیت کا مطلب:

اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ دعا کرو قبول میں کرتا ہوں۔ باقی یہ اس کا معنی نہیں کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرو اور فوراً ہی قبول ہو جائے۔ یہ معنی نہیں ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے خلاف دعا کی۔ سورت یونس میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے کہ یا اللہ! ان کے مال تباہ کر دے۔ یا اللہ! ان کے دل سخت کر دے۔ جب تیری طرف سے کوئی عذاب آتا ہے تو یہ نرمی کی باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو تو ان پر رحم کر دیتا ہے اتنے سخت ہوں کہ جب تک یہ عذاب الیم نہ دیکھیں یہ ایمان نہ لائیں۔ جیسے الفاظ آتے ہیں۔

فَلَا يُؤْمِنُوا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (سورة یونس آیت ۸۸)

اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہہ رہے تھے۔ دو نبیوں کی دعا ہے۔ سورت یونس کے اندر ذکر کی گئی دوسرے نبی کا ذکر صراحتاً نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو جواب آیا ہے۔

قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا

"تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی"

پیچھے قال موسیٰ اور آگے ... قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا ...تو تثنیہ کی ضمیر آگئی تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی اس سے معلوم ہوگیا کہ ہارون علیہ السلام بھی دعا میں شریک تھے اور ان کی شرکت یہی لکھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے اور آمین کہنے والا جو ہے۔ وہ دعا میں شریک ہوتا ہے۔

قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا (سورۃ یونس آیت ۸۹)

اپنے کام پر لگے رہو۔ دعا تمہاری قبول ہوگئی۔ اپنے کام پر لگے رہو۔ جلدی نہ مچانا۔ یہ دعا ظاہر کب ہوگی؟ جب اللہ کو منظور ہوگا۔ تم اپنے کام میں لگے رہو۔

تو مورخین نے، مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کرنے میں اور فرعون کے غرق ہونے میں چالیس ۴۰ سال کا فاصلہ ہے۔ یعنی جس دعا کی بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہدیا کہ میں نے قبول کر لی۔ اس کا اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے جب چاہے قبول کر لے۔ کوئی ضروری نہیں کہ آپ ہاتھ اٹھائیں اور اسی وقت قبول ہو جائے۔ مانگتے رہو، مانگتے رہو۔ جب آپ کیلئے مصلحت ہوگی، اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوگا۔ اس وقت آپ کی دعا کی قبولیت کے آثار نمایاں ہو جائیں گے۔

بالآخر تمنا پوری ہوگئی:

تو ایسے ہی طالب علمی کے زمانے سے دعا کرتے کرتے تقریبا پچیس سال گزر گئے۔ تو پچیس، چھبیس سال کے بعد (اس عرصے کے دوران پانچ، چھ مرتبہ حج کیلئے درخواست دینے کا موقع بھی ملا۔ جب کہ حج کا خرچ اس وقت صرف ساڑھے بارہ سو روپے ہوتا تھا جب میں یہاں کہروڑپکا آیا ہوں۔ اس سال بھی میری حج کی درخواست تھی اس قت سولہ سو روپے خرچ تھا۔ بتیس سو میں میری اور گھر والوں کی دونوں کی

درخواست تھی۔ اس وقت بھی نہیں نکلی۔ حاجیوں کی تعداد کم ہوتی تھی۔ قرعہ اندازی ہوتی تھی۔ تو اس وقت بھی نہیں نکلی۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا وقت آیا، اللہ نے اسباب فراہم کئے تو اخراجات بھی مہیا ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ سفر کی نوبت آگئی۔ اس طرح یہ قبولیت چاہے دیر کے بعد نمایاں ہوئی لیکن جتنا تسلسل کے ساتھ اللہ سے مانگا تھا اور جتنا پوری توجہ کے ساتھ اللہ سے گڑگڑا کر مانگا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر اتنا ہی کرم ہوا اور اتنا ہی اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھل گئے۔ آپ کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ لوگ بھی حرمین شریفین کی حاضری کیلئے ابھی سے اللہ کے سامنے دعا شروع کریں اور اللہ سے اسی طرح مانگا کریں۔ انشاء اللہ العزیز آپ کو بھی اسباب مہیا ہوں گے۔

ملتزم میں دعا کی اہمیت

دوسری بات یہ کہ ہمارے ہاں جو مسلسلات ہیں (بعض حدیثیں جو سلسلہ وار آتی ہیں۔ مسلسل روایات، مسلسل احادیث، جن کو بڑے درجے کے لڑکے جانتے ہیں۔ میں مشکوۃ والوں کو تو نہیں۔ دورے والوں کو در مشکوۃ والوں کو بھی بعض مسلسلات کی اجازت دیا کرتا ہوں) میں نے حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری زاد الطالبین والے ان سے اس کی اجازت مفصل حاصل کی تھی۔ مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھ کر ساری روایتیں سنا کر میں نے اجازت حاصل کی تھی۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب ہے اس میں بھی مسلسلات کا ذکر ہے۔ یہ جو مسلسلات میں نے مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ سے حاصل کی تھیں اس میں یہ روایت نہیں ہے کہ الفرانی کے علاوہ سے جو رسالے میں جمع کی ہوئی ہیں۔ یہ روایت اس میں ہے۔

جو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب میں ہے وہ ہے مسلسل ملتزم کی قبولیت دعا کے بارے میں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو یہاں ملتزم ہے۔ (حجر اسود اور بیت اللہ کے دروازے کا درمیان والا حصہ) ملتزم اصل میں کہتے ہیں چمٹنے کی جگہ کو تو حضور ﷺ

نے یہاں بیت اللہ کے ساتھ چمٹ کر دعائیں مانگیں تھیں۔ اپنا سینہ ساتھ لگا کر، بازو پھیلا کر، جس طرح سے انسان بغل گیر ہو جاتا ہے۔ اسطرح سے چمٹ کر دعائیں مانگی تھیں۔ تو اس حصہ کو ملتزم کہتے ہیں۔

اور علماء امت میں یہ بات چلی آرہی ہے کہ ملتزم میں جو دعا کی جائے وہ قبول ہو تی ہے تو حضور ﷺ سے لیکر حضرت مولانا خلیل احمد سہانپوری تک شاہ ولی اللہ کا درمیان میں واسطہ آجاتا ہے۔ اس سند کے ساتھ یہ نقل کیا جاتا ہے کہ ہر استاد کہتا ہے کہ میں نے دعا مانگی تھی، ملتزم میں اللہ نے قبول کی۔ دوسرا کہتا ہے میں نے بھی مانگی تھی اللہ نے قبول کی۔ تیسرا کہتا ہے کہ میں نے بھی مانگی تھی، اللہ نے قبول کی۔ تو ہر راوی جو ہے وہ اپنی قبولیت کا تذکرہ کرتا ہے کہ میں نے دعا مانگی تھی اللہ نے قبول کی۔ میں نے دعا مانگی تھی اللہ نے قبول کی۔ یہ نہیں ساتھ ذکر کیا ہوتا کہ کیا مانگا تھا؟ بات سمجھ آئی کہ نہیں؟۔

ملتزم میں باب العلوم کیلئے دعا اور اس کی قبولیت

یوں کہتا ہر کوئی ہے کہ میرا تجربہ ہے کہ میں نے دعا کی تھی قبول ہوئی۔ میں نے دعا کی تھی قبول ہوئی۔ آخر تک یوں نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ اب میں بھی آپ کے سامنے اس تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے کہتا ہوں کہ میں نے بھی ملتزم میں دعا کی تھی جو اللہ نے قبول کی۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آپ نے کیا دعا کی تھی؟ جو اللہ نے قبول کی میں نے جو دعا کی تھی اور اللہ نے قبول کی وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ سننے کی نہیں، دیکھنے کی ہے۔ یہ باب العلوم کی آبادی جس کے ساتھ میں دو لفظ بولتا ہوں ظاہراً باطناً۔ کہ یا اللہ باب العلوم کو ظاہراً و باطناً آباد کر۔ ظاہراً آباد کر۔

ظاہراً آبادی یہ ہے کہ تعمیرات، یہ آپ کی درسگاہیں، یہ بظاہر جو کچھ بن گیا، آپ کا مجمع، اجتماع، یہ ظاہراً آبادی ہے کہ دیکھنے والا اس کو سمجھتا ہے کہ واقعی بہت آبادی ہے۔ یہ وہ آبادی ہے جو ظاہراً کا مصداق ہے اور باطنی آبادی وہ برکات ہیں جو تعلیم کے

نتیجے میں ظاہر ہو رہی ہیں۔

حکیم العصر کی دعا کی برکت سے باب العلوم کی آبادی:

میں اس بات پر بہت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں میرے ہاں یہ محاورہ نہیں چلتا کہ میں اس بات کو باعث فخر سمجھتا ہوں یہ محاورہ میں نہیں بولا کرتا فخر کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ تو حضور ﷺ اپنی باتیں بتاتے ہیں۔تو فرماتے ہیں۔

اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا فَخْرَ وَبِیَدِیْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ
(مشکوۃ ۱۱/۵۱۳_ترمذی ۲/۱۴۷_۲۰۲)

قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا یہ بات بطور فخر کے نہیں کہہ رہا۔ میں بنی آدم کا سردار ہوں فخر کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ یہ لا فخر آ گیا۔ یہ تو سنت ہے۔تو فخر کے طور پر نہیں بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے، تحدیث بالنعمت کے طور پر، ایک بات کو ذکر کیا جائے کہ اللہ کا شکر ہے کہ یہ عطا فرما دیا۔اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے یہ عطا فرما دیا۔تو یہ تحدیث بالنعمت بطور شکر کر کے یہ مطلوب ہے۔ یہ قرآن میں ہے۔

وَ اَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (سورہ ضحی آیت۱۱)

اللہ کا جو انعام ہوا اس کو بیان کیا کرو۔ یوں کہہ کر کہ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے فلانی نعمت عطا فرمائی۔ تو باطنی برکات کا مطلب یہ ہے کہ باب العلوم کو اللہ نے علاقہ کیلئے، اردگرد کے لوگوں کیلئے، یہاں کے پڑھے ہوؤں کے ذریعے سے، پورے ملک میں مختلف شہروں میں جو دینداری کا فائدہ پہنچایا ہے یہ باطنی آبادی ہے

آپ پھر کر دیکھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ باب العلوم سے علاقے کو کتنا فائدہ پہنچا ہے؟ بستی بستی میں حافظ، بستی بستی میں عالم، باب العلوم کے تیار کئے ہوئے پہنچ گئے اور اس بات پر بھی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق باب العلوم سے فارغ التحصیل طلباء میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی ہو کہ جسکو آگے دین کی توفیق نہ ہوئی ہو اور وہ صرف کاروباری ہو کر رہ گیا ہو۔ ورنہ اکثر و بیشتر طلباء جن کو ہم

جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دین کیلئے قبول کیا ہے۔

- چاہے وہ درجہ قرآن میں پڑھا رہا ہے۔
- چاہے وہ درجہ کتب میں پڑھا رہا ہے۔
- چاہے کسی مسجد میں امامت کرا رہا ہے۔
- چاہے کسی مسجد میں خطابت کر رہا ہے۔

جو بھی شعبہ آ گیا وہ سب دین کی خدمت کا شعبہ ہے۔

نورانی قاعدہ پڑھانے والوں کی عظمت

حتیٰ کہ جنگل میں بیٹھا ہوا اگر ایک آدمی نورانی قاعدہ بچوں کو پڑھاتا ہے وہ بھی اس دین کا ایک حصہ ہے۔ وہ بھی گویا دین کی خدمت کر رہا ہے۔ دین نورانی قاعدہ سے لے کر بخاری تک پڑھانے کا نام ہے۔ دین کی خدمت کے اعتبار سے سب ایک ہی ہیں، کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ ایسے سمجھو گے جس طرح سے مجموعی طور پر ایک انجن ہے۔ یہی آپ کے سامنے ٹیوب ویل چلتا ہے اور اگر انجن کا کوئی اور پرزہ سامنے نہ بھی ہو تو اس میں ایک پرزہ تو آپ کو بہت ہلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جو نیچے سے پانی کھینچ کر لاتا ہے۔ اور بعض پرزے جنکو کابلے کہتے ہیں۔ جو ایک جگہ کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ٹکے بیٹھے ہیں۔

اگر یہ پنکھا کہے کہ کام تو سارا میں کرتا ہوں دوسرے تو ایسے ہی ہیں۔ ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں اور وہ جو جمے بیٹھے ہیں وہ کابلے ہیں جو کسے ہوئے ہیں۔ اب وہ آگے سے کہہ دیں کہ بہت اچھا ہم اپنی جگہ سے تیری طرح ہل کر دکھاتے ہیں پھر تو پانی نکال کر دکھا۔ تو کیا خیال ہے آپ کا۔ اگر کابلے ہلنے لگ جائیں پانی آ جائے گا؟ (نہیں) ۔بہت ہلنے والا بھی بیکار ہو کر بیٹھ جائے گا۔

جس سے معلوم ہوا کہ پانی نکالنے میں جتنا دخل اس پنکھے کا ہے۔ اتنا ہی دخل اس کابلے کا ہے جو کسا ہوا ہے۔ لیکن اس کا مقام ہے اپنی جگہ کسے رہنا اور اُس کا مقام ہے

حرکت کرنا۔

ہم آٹا پیستے ہیں۔اب آٹا تو پیستے ہیں پتھر۔اور پتھروں کے درمیان میں ایک کیل کھڑی ہوتی ہے۔آپ کو معلوم ہے عربی میں اسکو قطب کہتے ہیں۔قطب جس کے سہارے پر پتھر گھومتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آٹا پیسنے میں جیسے ان دونوں پتھروں کا دخل ہے ویسے ہی اس کیل کا دخل ہے۔آٹا پیسنا صرف ان پتھروں کا کام نہیں اس کیل کا کام بھی ہے۔

بالکل اسی طرح سے ہے اگر ہم کہنے لگ جائیں بخاری تو ہم پڑھاتے ہیں اور درجہ قرآن والے کیا ہیں؟ اب ت ث پڑھاتے ہیں باہر کے مدرسے میں ،جنگل میں بیٹھے ہوئے جو قاعدہ پڑھاتے ہیں یہ کیا کرتے ہیں؟ کام تو ہم کرتے ہیں۔لیکن آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ قاعدہ پڑھانے والے قاعدہ پڑھانا چھوڑ دیں۔تو بخاری پڑھانے والے کہاں سے آجائیں گے؟ ارے بات سمجھ رہے رہو؟ اگر یہ قاعدہ پڑھانے والے قاعدہ پڑھانا چھوڑ دیں تو یہ بخاری پڑھانے والے کہاں سے آجائیں گے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی خدمت نورانی قاعدے سے شروع ہوتی ہے۔اورنورانی قاعدہ سے لے کر بخاری پڑھانے تک جتنے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں اگر چہ ان میں سے بعض نظر آتے ہیں کہ بڑی کتابیں پڑھاتے ہیں،بعض نظر آتے ہیں کہ چھوٹی کتابیں پڑھاتے ہیں۔لیکن اللہ کے نزدیک دین کی خدمت کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔

دین کا ہر شعبہ اپنی جگہ اہم ہے:

اس لیے یہ سلسلہ سارے کا سارا جو پھیلا ہوا یہ ایک ہی مشینری ہے۔جو دین کا کام کر رہی ہے اس میں کابلہ برابر کا شریک ہے اور متحرک پرزہ جو ہے وہ بھی اسی طرح سے شریک ہے۔اکیلے متحرک پرزے سے کچھ نہیں ہوا کرتا۔

۞ چاہے نظام تعلیم ہو۔

- چاہے نظام تبلیغ ہو۔
- چاہے نظام تصنیف ہو۔

جو کچھ بھی ہے وہ سارے کا سارا اول سے لے کر آخر تک بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اصل کام تو کرتے ہی وہ ہیں جو دیہاتوں میں بیٹھے نورانی قاعدہ پڑھا رہے ہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیتے ہیں، ان کو ناک صاف کرنا نہیں آتا، ان کو وضو کرنا نہیں آتا، بیٹھنا نہیں آتا، اٹھنا نہیں آتا، تو ساری محنت وہ کرتے ہیں۔ جب لڑکا کسی قابل ہوتا ہے تو اٹھا کر کسی بڑے مدرسے میں بھیج دیتے ہیں۔تو جس ادارے سے اللہ تعالیٰ یہ فیوضات منتشر کرے یہ باطنی آبادی ہے۔

جیسے مسجد کی ظاہری آبادی یہ ہے کہ نقش ونگار کردیا۔لیکن مسجد کی باطنی آبادی کیا ہے کہ

- وہاں نماز پڑھنے والے اچھے ہوں۔
- وہاں بیٹھ کر تلاوت کرنے والے ہوں۔
- اللہ اللہ کرنے والے ہوں۔

تو مسجد کی آبادی جو ہے۔ وہ اس طرح اللہ کے ذکر سے ہوتی ہے۔تو یہ وہی قبولیت دعا ہے۔جس کا تذکرہ میں آپ کے سامنے کررہا تھا۔تو اس کے ساتھ ساتھ یہ آثار جو ظاہر ہوتے ہیں۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جو دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو باطنا آباد کرے۔وہ دعا اصل کے اعتبار سے آپ لوگوں کیلئے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین کی صحیح سمجھ دے اور دین کے اوپر ثابت قدم رکھے اور آپ یہاں سے محنت کر کے علم حاصل کریں اور علم حاصل کر کے آگے پھیلائیں۔تو وہ دعا آپ سب کو شامل ہوتی ہے تو وہ دعا جب ہم کرتے ہیں آپ کے حق میں بھی قبول ہوتی ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ وہاں کی حاضری یوں سمجھ لیں کہ وہ آپ کیلئے بھی برکات کا باعث ہے۔

قبولیت دعا میں بعض اوقات اور جگہوں کا اثر

بس آپ حضرات کا کام یہ ہے کہ آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے خیریت سے رکھے۔صحت وعافیت سے رکھے۔دعائیں تو یہاں بھی کرتا ہوں۔ کیونکہ دعا تو ہر جگہ قبول ہوتی ہے، ہر وقت قبول ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بعضے بعضے اوقات اور بعضے بعضے مکانات ایسے متعین کئے ہیں کہ جن میں قبولیت زیادہ متوقع ہوتی ہے۔

- جیسے جمعہ کے دن کی دعا قبول ہوتی ہے۔حدیث میں ذکر آتا ہے۔(بخاری ١/١٢٨۔مسلم ١/٢٨١)
- نصف شب کے بعد کی دعا ہوگئی۔اس کا بھی حدیث میں ذکر آتا ہے۔(مسلم ١/٢٥٨)
- فرض نماز کے بعد دعا ہوگئی، اس کا بھی ذکر حدیث میں آتا ہے۔(ترمذی ٢/١٨٧۔مشکوٰۃ ١/٨٩)
- دوازانوں یعنی اذان اور اقامت کے درمیان میں بھی دعا قبول ہوتی ہے۔(مشکوٰۃ ١/٦٦۔ابوداود ١/٧٧۔ترمذی ١/٥١)

یہ اوقات ترجیح رکھتے ہیں۔ورنہ یہ نہیں کہ باقی اوقات میں اللہ سنتے نہیں۔لیکن نہیں۔ان اوقات میں ترجیح ہے کہ ان میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ایسے مقامات کے اعتبار سے طواف کرتے ہوئے ملتزم میں۔حجر اسود کے سامنے، صفا مروہ پر۔میزاب رحمت کے نیچے، عرفات میں یہ مکانات ترجیح رکھتے ہیں کہ وہاں دعا کی جائے تو وہ زیادہ قبول ہوتی ہے ورنہ یہ نہیں کہ باقی جگہ نہیں ہوتی۔ بلکہ باقی جگہ کے مقابلے میں ان جگہوں کو ترجیح ہے۔اس لیے وہاں جاکر جو دعا ہوتی ہے اس کی برکات جلدی سامنے آجاتی ہیں۔

تو آپ حضرات نے ذہنی طور پر میرے ساتھ جڑے رہنا ہے۔بات سمجھ آئی کہ

نہیں؟۔ اس خیال کے ساتھ کہ ہم دعا کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صحیح سلامت صحت و عافیت کے ساتھ رکھے اور اللہ ان کی دعاؤں کو وہاں قبول کرے اور میں تو آپ کے ساتھ جڑا ہی رہتا ہوں۔ وہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ میں نے

- نہ تو اپنے بیٹے کی فکر کرنی ہے۔
- نہ اپنی بیٹی کی فکر کرنی ہے۔
- نہ کسی کی شادی کرنی ہے۔
- نہ کسی کا نکاح کرنا ہے۔
- نہ کسی کیلئے جائیداد کا انتظام کرنا ہے۔

میں تو جیسا تیسا ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ لوگ ہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میری تو ساری دعائیں آپ حضرات کیلئے ہوتی ہیں۔ محنت کے ساتھ اپنا علم حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں۔ اپنی صحت کو اور اپنی فرصت کو غنیمت سمجھیں۔

دو عظیم نعمتیں اور لوگوں کی محرومی:

حدیث میں آتا ہے کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن میں اکثر لوگ خسارہ پاتے ہیں نقصان پاتے ہیں۔

نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ

دو نعمتیں ایسی ہیں جس میں اکثر لوگ خسارہ پاتے ہیں۔

الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ

وہ دو نعمتیں یہ ہیں۔ ایک صحت اور دوسری فراغت، فرصت۔

(بخاری ۹۴۹/۲۔ مشکوۃ ۴۳۹/۱)

خسارے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قیمتی چیز دے دی۔ لیکن مقابلے میں کمایا کچھ بھی نہیں۔ صحت ایسی نعمت ہے کہ ہم لوگ اس کو ضائع کر لیتے ہیں۔ اس سے صحیح معنی میں فائدہ نہیں اٹھاتے اور ایک فرصت کے اوقات۔ کہ اللہ نے آپ کو فارغ کیا ہے

۔کوئی آپ کے ذمہ فکر نہیں ۔صرف ایک پڑھنے کی فکر ہونی چاہیے۔

- روٹی کی آپ کو فکر نہیں۔
- رہنے کی آپ کو فکر نہیں۔ .
- ضروریات کی آپ کو فکر نہیں۔

فارغ ہو کر اپنے علم میں محنت کیجئے۔صحت اور فراغ ان دونوں کو اپنے لیے غنیمت سمجھیں ،اس سے فائدہ اٹھائیں۔انشاء اللہ العزیز جب جانبین آپس میں لگے رہیں گے اور ادھر حدیث میں یہ بشارت بھی ہے کہ جب کسی کے لیے پس پشت دعا کی جاتی ہے۔ یہ بھی قبولیت کا ایک باعث ہے کہ سامنے دعا کرنے کی بجائے ۔

اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ

حدیث میں یہ لفظ آتے ہیں کہ سب سے قبولیت والی بات ہوتی ہے۔ایک دوسرے کیلئے پس پشت دعا کرنا۔ (مشکوۃ ۱/۱۹۵۔ترمذی ۲/۱۹)

تو آپ بھی کریں گے انشاء اللہ میں بھی کروں گا ۔اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائیں (آمین) آپ حضرات کو بھی صحت و عافیت کے ساتھ علم حاصل کرنے کی توفیق دے(آمین) اپنے آپ کو جوڑ کر رکھنا ہے، انتظام میں رہنا ہے، منتظمین کی ہدایات پر عمل کرنا ہے

ختم خواجگان کے بعد دعا کی قبولیت

اور عصر کے بعد کی یہ دعا جو ہوتی ہے (بسا اوقات یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے) یہ اتنی اہم دعا ہے کہ آپ اس میں شوق کے ساتھ شرکت کر کے اپنے لیے دعا کیجئے اور اگر آپ اپنے لئے نہ کریں تو آہستہ آہستہ دعا کرنے والے کی دعا پر" آمین" کہتے رہیں۔تو اس دعا میں آپ کی شرکت بھی ہو جائے گی۔ یہ تجربے کی بات ہے(قرآن و حدیث کا مسئلہ نہیں ۔) ہمارے اکابر کے ہاں تجربے کی بات ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد دعا بھی قبول ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں یہ وظیفہ پڑھا جاتا تھا۔ (میں آپ کو بتا دوں) اگر کوئی باہر کا آدمی اس موقع پر دعا کروانا چاہتا تو وہ کچھ پیسے دیتا تھا (حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ تو میں نے دیکھی ہے لیکن حضرت کا یہ معمول اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔) لیکن حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے ٹنڈو اللہ یار میں شیخ الحدیث تھے۔ ان کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ عصر کے بعد یہ وظیفہ پڑھتے تھے اور اگر کوئی کہتا کہ میرے لیے دعا کرنی ہے تو ان کے پاس اتنی ساری وہ تختی رکھی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کے اوپر وہ نام لکھتے تھے کہ فلانے کیلئے اس مقصد کیلئے دعا کرنی ہے۔ اور وہ شخص دعا کروانے کیلئے دس روپے ہفتے کے جمع کرواتا تھا جب ہفتہ پورا ہو جاتا تھا اس کا نام کاٹ دیتے تھے۔ تو وظیفہ پڑھنے کے بعد ایک لڑکا وہ تختی لے کر کھڑا ہو جاتا تھا۔

- یا اللہ! فلانے کو مقدمہ میں فتح دے۔
- یا اللہ! فلانے کا بیٹا بیمار ہے اس کو صحت دے۔
- یا اللہ! فلانے کی بھینس بیمار ہے اس کو صحت دے۔

وہ اس طرح پڑھتا تھا اور سارا مجمع جو تھا وہ ''آمین۔ آمین'' کہتا تھا اور اُس زمانے کے دس روپے اس زمانے کے سو روپے کے برابر ہوں گے۔ تو اس وقت پیسے دے کر لوگ دعا کرواتے تھے۔ بات سمجھے کہ نہیں؟ تو یہ اتنی اہم ہے۔

رائے پور میں بھی پڑھی جاتی تھی، سہارنپور میں بھی پڑھی جاتی تھی، اور اب بھی ہمارے حضرت نفیس شاہ صاحب کے ہاں بھی پڑھی جاتی ہے۔ خیر المدارس بھی پڑھتے ہیں۔ تو اس دعا کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے دلچسپی لے کر بیٹھا کرو۔ پورے دھیان کے ساتھ، مجبوری سے نہیں کہ جیسے باہر کس نے روک دیا تو آکر بیٹھ گئے۔ اگر کسی نے نہیں روکا تو بھاگ گئے۔

اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی

رغبت نہیں ہے۔اس لیے تو قبول نہیں ہوتی۔ رغبت کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کیا کیجئے۔اس کی بہت برکات ہیں۔اس لیے عصر کے بعد بے دلی کیساتھ نہ بیٹھا کرو۔ خوب اچھی طرح سے توجہ کے ساتھ بیٹھا کرو بلکہ میں مفتی صاحب کو کہتا ہوں کہ بچیوں میں بھی اس کو جاری کرو۔ ایک وقت میں چاہے صبح، چاہے شام، ایک وقت میں اس طرح سے پڑھ کر دعا کیا کریں۔

ہمارے لیے ہے تو صرف ایک ہی سہارا۔کہ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا۔ ورنہ ہمارے پلے ہے کیا؟ اتنا خرچہ مدرسے کا سنتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اللہ دیتا ہے۔ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے لیکن الحمد اللہ یہاں آئے ہوئے مجھے بتیس (۳۲) سال ہو گئے۔ایک دن بھی فاقہ نہیں کرنا پڑا۔ باقی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔اس لیے توجہ کے ساتھ مانگا کرو۔ دعا میں دلچسپی لیا کرو اور ویسے بھی نجی طور پر ہر نماز کے بعد اپنے لیے اس قسم کی دعا کیا کرو۔ یہ تذکرہ میں نے آپ کے سامنے آپ کو ترغیب دینے کیلئے کیا ہے۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ۔

و اخرو دعوانا ان الحمد اللہ ر ب اللعلمین

فُضیلت لیلۃ القدر

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ "وَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَ آخِرُہٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ (مشکوۃ ۱۷۳،۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

حدیث کا ترجمہ

نبی پاک نے رمضان المبارک کے بارے میں فرمایا کہ

اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ

اس کا پہلا حصہ رحمت ہے۔یعنی کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ

اور اس کا جو درمیانہ حصہ ہے جس کو دوسرا عشرہ کہہ لیجئے۔ دوسری تہائی یہ بخشش ہے۔اللہ تعالیٰ اس تہائی میں اپنے بندوں کے گناہ معاف کرتے ہیں

وَ آخِرُهٗ عِتْقٌ مِنَ النَّار

اور جو آخری تہائی ہے، آخری دس (۱۰) دن، یہ جہنم سے آزادی ہے یعنی ان دس دنوں میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم سے آزاد کرتے ہیں جہنم سے آزادی کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ ہے اس روایت کا ترجمہ جو آپ کے سامنے پڑھی گئی۔

رمضان المبارک ایک عظیم نعمت:

رمضان المبارک اللہ تعالیٰ کی اتنی عظیم نعمت ہے کہ جس کی قدر جاننے والے ہی جانتے ہیں اور ہم جیسے غافل لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔دو حصے گزر گئے اور آج سے تیسرے حصے کی ابتداء ہے۔ آج اکیسواں روزہ ہے گویا کہ آخری حصہ رمضان المبارک کا شروع ہے۔ اگر پہلا حصہ اللہ کے احکام کے مطابق گزارا ہے۔ تو اللہ کی رحمت ہم پر برسی اور اگر دوسرا حصہ اللہ کے احکام کے مطابق گزارا ہے۔تو اللہ کی طرف سے گناہوں کی معافی کا علان ہوا اور اگر تیسرا حصہ بھی اللہ کی مرضی کے مطابق گزاریں گے تو اللہ کی طرف سے جہنم کی آزادی کا اعلان ہوگا۔

عید منانے کے اصل حقدار:

اور اس جہنم سے آزادی کے اعلان کی خوشی میں پھر رمضان المبارک کے گزرنے کے بعد ہم عید منائیں گے۔ عید جو خوشی کا دن ہے وہ اس بات پر خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں موقع دیا۔ ہم نے اس کی رحمت کو حاصل کیا۔ ہم نے اس سے اپنے جرم معاف کروائے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں جہنم سے آزادی دے دی۔

عید کے دن اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ہم نماز بھی پڑھتے ہیں اور اللہ کا شکر بھی ادا کرتے ہوئے صدقہ خیرات بھی کرتے ہیں۔ تو عید اصل کے اعتبار سے اسی شخص کی ہے جس کو جہنم سے آزادی مل گئی اور جس نے رمضان المبارک صحیح نہیں گزارا۔ اور وہ محروم رہا کلیتاً محروم رہا، اپنی نیکی اس نے ضائع کر لی، اس نیکی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب وہ بھی اگر عید مناتا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ اس سے زیادہ حماقت اور اس کی بد نصیبی اور کیا ہوگی؟ کہ اللہ کی طرف سے اس کے اوپر لعنت پڑی۔ اللہ کی طرف سے اس کیلئے جہنم کے فیصلے ہو گئے اور وہ خوشیاں منا رہا ہے اس لئے عید منانے کا حق انہیں لوگوں کو ہے جو رمضان المبارک اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے عید انہی لوگوں کی ہے۔

اب بیس دن گزر گئے۔ دس دن باقی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان دس دنوں کے اندر پچھلے بیس دنوں کی کوتاہیوں کی بھی تلافی کر لیں۔ یہ دس دن پچھلے بیس دن کے مقابلے میں اور زیادہ اہم ہیں۔

لیلۃ القدر کی فضیلت اور اس کا تعین

ویسے تو آپ سنتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات رکھی ہے جس کو لیلۃ القدر کہتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ہزار مہینے سے افضل بنایا۔ اس ایک رات کی عبادت ایسے ہے جیسے کسی نے ہزار مہینے سے بھی زیادہ عبادت کر لی۔ وہ رات کونسی ہے؟

زیادہ تر توقع یہ ہے کہ جو لوگ پورے رمضان المبارک کی راتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اور ہر رات کی قدر پہچانتے ہیں۔ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت سے نواز دیے جاتے ہیں جو پوری راتوں کی قدر کرتے ہیں۔

بزرگوں کا قول ہے کہ

مَنْ لَمْ یَعْرِفْ قَدْرَلَیْلَةٍ لَا یَعْرِفُ لَیْلَةَ الْقَدْرِ

جو آدمی عام راتوں کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ وہ لیلۃ القدر کو بھی نہیں پاسکتا۔ رمضان المبارک کی ہر رات قدر کرنے کے قابل ہے

تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ کا نزول

حدیث شریف میں آتا ہے کہ عام دنوں میں، سال کے باقی دنوں میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے چوبیس گھنٹوں میں وہ وقت آتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف بہت خصوصیت کے ساتھ توجہ فرماتے ہیں اور وہ ہے رات کا آخری تیسرا حصہ۔

- ہر رات میں۔
- سال کے بارہ مہینوں میں۔
- بارہ مہینوں میں سے ہر مہینے کے تیس (۳۰) دنوں میں۔
- اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں بندوں کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔

سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق جس طرح سے اس کی شان ہے آسمان دنیا پر جو سب سے قریبی آسمان ہے۔ اس پہ تشریف لاتے ہیں جیسے اس کی شان کے لائق ہے اور اپنے بندوں کی طرف توجہ کر کے اعلان کرتے ہیں

اَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَهٗ . اَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَاَرْزُقَهٗ . اَلَا مُبْتَلیً فَاُعَافِیَهٗ

(مشکوٰۃ ۱/۱۱۵۔ ابن ماجہ ۱/۹۹)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کیطرف سے اعلان ہوتا ہے۔ الا کذا. الا کذا۔ بندوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ

- کوئی ہے جو مجھ سے معافی مانگے میں اسے معاف کردوں۔
- کوئی ہے جو مجھ سے رزق طلب کرے اسے رزق دیدوں۔
- کوئی ہے جو مجھ سے صحت وعافیت مانگے تو میں اسے صحت وعافیت دیدوں۔
- کوئی ہے فلانی چیز طلب کرنے والا کہ میں اس کی حاجت پوری کردوں۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو خطاب ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ طلوع فجر ہو جاتی ہے اور طلوع فجر کے بعد یہ فضیلت ختم ہو جاتی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کو اپنے کانوں سے نہیں سنتے۔ لیکن ہمیں جس زبان نے اطلاع دی ہے اس کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے اور اس کے بتانے پر ہمیں اتنا یقین ہے کہ اگر ہم اپنے کانوں سے سنتے تو بھی شاید اتنا یقین نہ آتا۔ اس سے زیادہ سچی زبان اللہ تعالیٰ نے کوئی پیدا نہیں کی جس زبان نے ہمیں یہ بتایا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس طرح سے اپنے بندوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسے کہتے ہیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے جو وقت سونے کا ہے (عشاء کے بعد) اس میں ہم کھیل میں، تماشوں میں، لگے رہتے ہیں اد جو وقت جاگنے کا ہے اس میں مست ہو کے سوتے ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے۔

تو یہ فضیلت سب راتوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے گھر آ کے کہتے ہیں۔ آسمان آپ کیلئے چھت ہے۔ زمین آپ کیلئے فرش ہے۔ تو گھر آ کے کہتے ہیں کہ لو میں رحمت بانٹنے کیلئے آیا ہوں اور ایسے وقت میں جو اگر کوئی شخص فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس سے زیادہ محرومی اور کیا ہو سکتی ہے؟۔

اس لیے رات کی قدر وہی جانتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہو اس وقت کو اٹھ کے اللہ کو یاد کرنے کی اور اس کے سامنے آنسو بہانے کی اور ہاتھ پھیلانے کی۔ انکو پتہ ہے کہ اس رات کے حصے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا نعمتیں ملتی ہیں اور انسان کی روح اور دل کو کتنا سکون حاصل ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی دولت، دنیا کا کوئی

عہدہ، دنیا کی کوئی نعمت، انسان کو وہ سرور، روحانی لذت اور دلی اطمینان نہیں دلا سکتی جو رات کے آخری کے حصہ میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر چار آنسو بہانے سے یا اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنے عرض معروض کرنے سے جو سکون حاصل ہوتا ہے۔ دنیا کی کسی نعمت کے ساتھ وہ سکون حاصل نہیں ہو سکتا، کسی دولت سے خریدا نہیں جا سکتا۔

لیکن یہ ان کو ہوگی جو کہ اس وقت کی قدر کرتے ہیں۔ یہ تو عام راتوں کی بات ہے اور جو رمضان المبارک کے مہینے میں یہ فضیلت سورج چھپتے ہی شروع ہو جاتی ہے پورے مہینے میں۔ کہ ہر رات میں اللہ تعالیٰ ساری رات بندوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ مغرب سے شروع ہو کر فجر تک یہ تو عام راتوں کی بات ہے۔

اس لیے تو بزرگ کہتے ہیں کہ

اے خواجہ چہ پرسی ز شب قدر نشانی
ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی

شب قدر، لیلۃ القدر کی نشانیاں کیا پوچھتے ہو؟ ہر رات لیلۃ القدر ہے اگر تم قدر پہچانو۔ قدر کرنے والوں کیلئے ہر رات لیلۃ القدر ہے۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر چند راتوں میں خصوصی توجہ ہوتی ہے اور وہ ہے آخری عشرے کی طاق راتیں زیادہ تر روایات کا رجحان یہی ہے۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ اگر پورے رمضان کی راتوں کی پابندی کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سعادت یقیناً مل جائے گی اور اگر زیادہ نہ ہو سکے تو آخری عشرے کی دس راتیں، انکا اہتمام کرو اور اگر دس کا نہ کر سکو۔ تو کم از کم طاق راتوں کا اہتمام کرو۔ ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، ان راتوں میں سے کوئی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے۔

ستائیس کو لیلۃ القدر یقینی نہیں:

ستائیس کوئی متعین نہیں ہے اور یہ بھی ایک جہالت کا مغالطہ ہے کہ لوگ باقی راتوں میں تو اہتمام کرتے نہیں۔ ایک ستائیس کو پیش نظر رکھ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ تو یہ

کوئی ضروری نہیں کہ لیلۃ القدر ستائیس کو ہو۔ جو رات گزر گئی اس میں بھی ہوسکتی تھی۔ کیونکہ وہ اکیسویں کی رات تھی اور آگے ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، ابھی چار راتیں باقی ہیں ان کا اہتمام کرو۔ ہوسکتا ہے کہ پچھلی رات میں نہ ہو۔ ان چار راتوں میں سے کسی رات میں اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت رکھی ہوئی ہو۔ ان کو غفلت سے ضائع نہ کرو۔

لیلۃ القدر گذارنے کا صحیح طریقہ

اور لیلۃ القدر میں ساری رات جاگنا ضروری نہیں اور جاگنے کیلئے فضول دھندے اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ تو الٹا اور رحمت سے محرومی ہو جاتی ہے۔ شور مچانے کی، قصہ خوانی کی، کوئی ضرورت نہیں۔ گھر میں، خلوت میں، بیٹھ کے نوافل پڑھ لو، تلاوت کرلو، تسبیح پڑھ لو، جو بھی نیکی کا کام کرو گے، صدقہ خیرات کرو گے، وہ کام ایسے سمجھا جائے گا گویا کہ آپ نے ہزار مہینے سے زیادہ کیا۔

اگر دو رکعت آپ پڑھیں گے تو اب سمجھا جائیگا کہ ہزار مہینے کی راتوں میں آپ ہزار روز تک پڑھتے رہے۔ اگر ایک پارے کی تلاوت کرلو گے۔ تو ایسے ہو گا کہ ایک ہزار مہینے سے زائد آپ ایک پارے کی تلاوت کرتے رہے ہیں۔ جو نیکی کرو گے وہ نیکی اس طرح سے سمجھی جائے گی گویا کہ آپ نے ہزار مہینے سے زیادہ کی۔ ساری رات اس میں جاگنا ضروری نہیں ہوتا۔

اور اگر انسان پڑھتا ہوا تھک جائے، طبیعت نہ چاہے، تو گپ شپ لگانے کی بجائے اس نیت کے ساتھ کہ صبح اٹھ کے ہم نماز پڑھیں گے سو جاؤ۔ یہ سونا بھی عبادت ہے۔ اور اگر اللہ کی رحمت سے فائدہ اٹھاؤ۔ (اللہ کی رحمتیں موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی ہیں۔) تو بہت اچھی بات ہے اور سعادت ہے۔

خوش نصیب رات میں بعض لوگوں کی بدنصیبی:

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بات عرض کردوں سرور کائنات ﷺ جو اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کے بانٹنے کا ذریعہ بنے اور انھوں نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کے

دریاؤں کی نشاندہی کی۔انہی کا فرمان ہے کہ بعضے بعضے بدنصیب ایسے ہیں کہ جو اس فیض سے محروم رہ جاتے ہیں۔سب کچھ کرتے ہیں لیکن اللہ کے ہاں ان کی قبولیت نہیں ہوتی۔

ان میں دو باتوں کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ایک تو مشرک جس کا عقیدہ صحیح نہیں۔تو مشرک اللہ کی ہر رحمت سے محروم ہے۔اگر اس کے عقیدے میں شرک ہے تو پھر وہ ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر عبادت کرتا رہے اور اللہ اللہ کرتا رہے تو اس کے منہ پہ ماری جاتی ہے۔اس کی عبادت کی کوئی قدر نہیں (مشکوۃ ۱/۱۱۵)

- ہندو ہوں......سکھ ہوں۔
- عیسائی ہوں......یہودی ہوں۔

جو اسلامی نقطہ نظر سے کافر ہیں وہ بھی عبادتیں کرتے ہیں لیکن ان کی عبادتوں کا کچھ حاصل نہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (سورہ غاشیہ آیت ۳)

بعضے لوگ ایسے ہوں گے جو بڑی محنت کرنے والے ہوں گے اور محنت کر کے تھکے ہوئے ہوں گے لیکن

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (سورہ غاشیہ آیت ۴)

جائیں گے جہنم میں۔محنت کر کے تھکے ہوئے ہوں گے۔لیکن جائیں گے جہنم میں یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا عقیدہ ٹھیک نہیں۔

شرک کی مذمت

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنا عقیدہ ٹھیک کرو اور عقیدے کے اندر شرک کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے۔مشرک جو ہے وہ اللہ کی ہر رحمت کے ہر قطرے سے محروم رہتا ہے۔باقی رہا شرک کسے کہتے ہیں موٹی سی بات ہے اللہ کو وحدہ لاشریک جانو۔

- اللہ اپنی ذات میں ایک۔

- اللہ اپنی صفات میں ایک۔
- اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں۔
- اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ نہیں۔
- نہ زندے کو سجدہ، نہ مردے کو سجدہ۔

اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کرنا چاہے زندہ کو کرو، چاہے مردہ کو کرو، چاہے درخت کو کرو، چاہے قبر کو کرو اور اپنی مصیبت کے وقت میں اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی دہائی دینا شرک ہے کسی غیر کو پکارنا شرک ہے۔

انبیاء کی تاریخ قرآن کریم نے دہرادی۔ حضرت ایوب بیمار ہوئے تو اپنی بیماری کے ازالے کیلئے اللہ کے سامنے رورو رہے ہیں۔ حضرت زکریا کے ہاں اولاد نہیں تھی تو بچے کیلئے اللہ کے سامنے رورہے ہیں۔ جس کو بھی کوئی تکلیف پہنچی اللہ کو پکارتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے۔

اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی دہائی دینا، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر نذر و نیاز دینا، یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں جو ایمان کو خراب کر دیتی ہیں۔ نذر و نیاز اللہ کیلئے، دہائی اللہ کی۔ پکارنا اللہ کو ہے اور سجدہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو کرنا نہیں اور اجمالی طور پر عقیدہ رکھنا ہے کہ پوری کی پوری کائنات کا خالق وہ، مالک وہ، پالنے والا وہ، اور اس میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے اختیار سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے یہ اختیار کسی دوسرے کو نہیں دیے۔ اللہ کی اجازت کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

- کسی کی بیماری....... کسی کی صحت۔
- کسی کی موت....... کسی کی حیات۔
- کسی کا رزق....... کسی کی عزت۔
- کسی کا فقر....... کسی کا غنا۔

کسی دوسرے کے قبضے میں نہیں۔ یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ نے اپنے قبضے میں رکھی ہیں۔ اس طرح سے اپنے عقیدے کو اگر مضبوط رکھو گے تو عقیدہ ٹھیک ہے۔

- اللہ اپنی ذات میں واحد۔
- اللہ اپنی صفات میں واحد۔
- اللہ اس دنیا کے اندر تصرف کرنے میں واحد۔

اس دنیا کا تصرف اللہ نے کسی نہیں دیا۔ سازے کے سارے کام اسی کے ہیں۔ تو پہلے عقیدہ ٹھیک کرو۔ مومن بنو۔ جس وقت ایمان صحیح ہوگا تب رحمت آئے گی اور اگر عقیدہ کے اندر کسی قسم کا خلل ہوا تو پھر رحمت نہیں آئے گی۔

بدعت کی مذمت:

اور شرک کے ساتھ ساتھ بدعت سے اجتناب بہت ضروری ہے۔ بدعت کا مطلب ہوتا ہے سنت کے خلاف کرنا۔ اللہ کی عبادت کرو۔ لیکن کرو اس طریقے سے جیسے حضور ﷺ نے بتائی۔ کیونکہ اللہ کا ترجمان اللہ کا نبی ہوتا ہے۔ اللہ کس چیز سے خوش ہے وہ اللہ کا نبی بتائے گا۔ اللہ کو کونسی چیز پسند ہے وہ اللہ کا نبی بتائے گا۔

اپنی طرف سے تجویز کرنا اور اپنی طرف سے نئی نئی شکلیں نکال لینا کہ یوں کرنا بھی عبادت ہے اور یوں کرنا بھی عبادت ہے اس کا مطلب ہے یہ کہ آپ نے براہ راست اپنے آپ کو اللہ کا نمائندہ بنا لیا اور سرور کائنات ﷺ کو چھوڑ دیا اور جو آدمی حضور ﷺ کا دامن چھوڑ دے، پیغمبر آخر الزمان کا دامن چھوڑے دے اور اللہ کی ترجمانی کیلئے ان کو نہیں رکھا اور اللہ کی مرضیات ان سے نہیں پوچھتا بلکہ خود اللہ کا ترجمان بنکے بیٹھ گیا جس طرح سے وہ باتیں شرک فی التوحید ہیں۔ یہ باتیں شرک فی النبوت ہیں گویا کہ اپنے لئے وہ منصب تجویز کرتا ہے جو منصب اصل نبی کا ہے۔ اللہ کو کونسی چیز پسند ہے کونسی چیز پسند نہیں ہے۔ یہ بتانا نبی کا منصب ہے۔

اس لیے توحید وسنت دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ عبادت اللہ کی کرو۔

لیکن کرو اس طرح سے جس طرح سے حضور ﷺ نے بتائی شرکت سے بچو، بدعت سے بچو، تب جا کر انسان کا ایمان اور کردار صحیح ہوتا ہے۔ ورنہ ساری کرتی کرائی برباد ہو جاتی ہے۔

سنت اور بدعت کو سمجھنے کیلئے بہترین مثال:

سنت اور بدعت کو سمجھنے کیلئے ایک مختصر سی مثال آپ کی خدمت میں عرض کر دوں کہ ایک ہے آپ کے پاس حکومت کا جاری کیا ہوا نوٹ۔ چاہے وہ میلا ہے، چاہے کہیں سے پھٹا ہوا ہے، لیکن اس میں مہر محفوظ ہے اور دیکھنے والا پہچانتا ہے کہ حکومت کا جاری کیا ہوا ہے، پھٹا پرانا بھی ہو گا تو بھی وہ اپنی قیمت پالے گا۔ بشرطیکہ اس کی مہر پہچانی جائے کہ یہ حکومت کا جاری کیا ہوا ہے۔ وہ ضائع نہیں جاتا۔

اور بدعت کی مثال ایسے ہے جس طرح سے کوئی آدمی اپنے طور سے خوبصورت کاغذ بہترین پھول بوٹے کا بنا کر نوٹ بنا دے اور ملک میں جاری کر دے اور کہے کہ حکومت کا کاغذ تو ناقص ہے میں نے کاغذ اچھا بنا لیا۔ حکومت کے نوٹ پر تو پھول بوٹے کم ہیں میں نے پھول بوٹے زیادہ بنا لیے۔ دیکھو کتنا خوبصورت ہے اور اس قسم کا نوٹ لے کر بازار میں اگر کوئی جائے گا وہ قیمت نہیں پائے گا بلکہ

- جیل میں جائے گا۔
- پکڑا جائے گا۔
- مجرم سمجھا جائے گا۔

اس لیے سنت سادی سے سادی ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے کہ وہ حضور ﷺ کا طریقہ ہے۔ اور بدعت خوبصورت ہو تو بھی اللہ کے دربار کے اندر، اللہ کے مملکت میں جعلی سکہ جاری کرنے والی چیز ہے اس لیے یہ بہت بدترین قسم ہے۔

جس طرح سے شرک اللہ کی ذات میں جرم۔ اس طرح سے بدعت کا جاری کرنا حضور ﷺ کی نبوت کے اندر جرم۔ سنت کے مطابق عمل کرو سادہ سیدھا ہو ثواب ملے

گا۔ کیونکہ حضور ﷺ کا طریقہ آپ نے اپنایا اور اگر اپنی طرف سے تجویز کرو گے تو پھر کتنے خوبصورت کیوں نہ بنا لو گے۔ یہ اللہ کی مملکت کے اندر جعلی سکہ جاری کرنے والی بات ہے۔ اس پر کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس لیے خدارا اپنی عبادت کو ضائع نہ کیا کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کیا کرو۔ اللہ کی توحید کا سبق سیکھو اور سرور کائنات ﷺ کی سنت کی اہمیت محسوس کرو۔

لڑائی جھگڑے کی مذمت:

ایک تو مشرک اللہ کی رحمت سے محروم ہوتا ہے اور دوسرا یہ ہمارے اپنے معاملات کی بات ہے۔ سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسے دو مسلمان جنھوں نے آپس میں بول چال چھوڑی ہوئی ہے۔

- جو آپس میں بولتے نہیں۔
- جن کا آپس میں جھگڑا ہے۔
- ایک دوسرے سے کینہ رکھتے ہیں۔
- ایک دوسرے سے بغض رکھتے ہیں۔
- معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔

جس کے لئے حدیث میں لفظ ''مُشَاحِن'' کا آیا ہے کہ ایک دوسرے سے کینہ رکھنے والے، ایک دوسرے سے بغض رکھنے والے، اللہ ان کے بھی اعمال قبول نہیں کرتا۔ (مشکوۃ ۱/۱۱۵)

اس لیے اپنی برادری میں، اپنے ملنے والوں میں، اس بات کی شریعت بہت اہمیت محسوس کرتی ہے کہ سارے محبت سے رہیں، آپس میں بول چال ہو، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدرد ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہ ہوں، مشکل میں ایک دوسرے کے کام آنے والے ہوں۔

ذرا ذرا بات پر جھگڑا کر کے آپس میں بولنا چھوڑ دینا، تعلقات توڑ دینا، اس قسم کا

قاطع رحم، اس قسم کا اپنے بھائی کے ساتھ ضد یا کینہ رکھنے والا، سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ بابرکت راتوں میں وہ بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے معاملات کو بھی درست کرو اور اپنے گھروں کو بھی ٹھیک کرو۔ کہ برادری میں، بھائی چارے میں، آپس میں، محبت ہونی چاہیے۔ آپس میں ضد، ایک دوسرے کے ساتھ مخالفت، بول چال کا چھوڑ دینا، یہ اللہ کی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ تو اس بات کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ اپنے اعمال کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔

قرض اداء کرنے کی تاکید:

اور تیسری بات جس کی اہمیت ہے وہ ہے حقوق العباد، ایک دوسرے کے حق ادا کرنا، خاص طور پر قرض کے معاملے میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے کہ اگر کسی کا قرضہ دینا ہے تو قرضہ دینے کی فکر کرو۔

سرور کائنات ﷺ کے زمانے میں اگر کوئی شخص مقروض مر جاتا تھا اور اس کا جنازہ حضور ﷺ کے پاس آتا تھا تو آپ ﷺ پوچھا کرتے تھے۔ کہ کیا اس پر قرض ہے؟ اگر بتایا جاتا کہ قرضہ ہے تو پھر پوچھتے کہ اس نے پیچھے کوئی جائیداد چھوڑی ہے؟ جس سے اس کا قرضہ ادا ہو جائے۔ اسکا پیچھے ترکہ ہے؟ اور اگر بتایا جاتا کہ جی ہاں اتنا ترکہ ہے کہ قرضہ ادا ہو جائے گا تو جنازہ پڑھا دیتے تھے اور اگر یہ پتہ چلتا کہ پیچھے بھی کچھ نہیں چھوڑ کے گیا اور اس کے قرضے کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو حضور ﷺ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیتے تھے۔

ایسے واقعات حدیث شریف میں موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے انکار کر دیا کہ میں جنازہ نہیں پڑھاتا پھر ایسا ہوا کہ ایک آدمی اٹھ کے کھڑا ہوا اس نے کہا یا رسول اللہ! اس کے قرضے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں، اس کی جگہ قرضہ میں ادا کروں گا، یہ مسلمان آپ کے جنازے سے محروم نہ رہے۔ آپ جنازہ پڑھا دیں۔ تو جب کوئی قرضے کی ذمہ داری لے لیتا تب حضور ﷺ اس کا جنازہ پڑھاتے۔

(بخاری ۱/۳۰۵۔ مشکوۃ ۱/۲۵۲)

اتنی زیادہ اہمیت ہے اس بات کی کہ کسی کا پیسہ اگر دینا ہے تو یہاں دیدو۔

حقیقی مفلس کون؟

ایک دفعہ حضور ﷺ صحابہ کی مجلس میں بیٹھے تھے آپ نے پوچھا کہ تمہیں پتہ ہے کہ مفلس کون ہے؟

"أَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟ "

تمہارے اندر مفلس کون ہے؟ تو صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس پیسے نہ ہوں۔ درہم نہ ہو، دینار نہ ہو۔ سونا نہ ہو، چاندی نہ ہو۔ ہم مفلس اس کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ شخص ہوگا کہ جو میدان قیامت میں آئے گا تو اس کے پاس نماز، روزہ، زکوۃ، تلاوت، ہر قسم کی نیکی ہو گی، نیکیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے۔

لیکن جب فیصلہ ہونے لگے گا تو

- ایک دعویٰ لے کے آئے گا کہ اس نے مجھے گالی دی تھی۔
- ایک دعویٰ لے کرے آئے گا اس نے میرا حق مارا تھا۔
- ایک دعویٰ لے کے آجائے گا کہ اس نے میرا قرض دینا ہے۔

وہاں پیسے تو ہوں گے نہیں اور اللہ تعالیٰ اس کی نیکیاں اس مدعی کو دینی شروع کر دیں گے اور حقداروں کو یہ تقسیم کرنی شروع کریں گے۔ حتیٰ کہ حقوق ختم نہیں ہونگے اور نیکیاں ختم ہو جائیں گی۔ جب نیکیاں ختم ہو جائیں گی۔ صاحب حقوق ابھی کھڑے ہوں گے کہ اس نے میرا بھی دبایا ہوا ہے اس نے میرا بھی دبایا ہوا ہے۔ اس نے میرا بھی دینا ہے۔

تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اس بندے کے گناہ لے لے کر اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ڈالنا شروع کر دیں گے جس وقت یہ فارغ ہوگا۔ جس طرح پہلے آیا تھا تو

نیکیوں کے ڈھیر لے کر آیا تھا۔ فارغ ہو گا تو گناہوں کے ڈھیرے لدے ہوئے ہوں گے۔ تو یہ ہے صحیح معنوں میں مفلس۔ جو اس میدان میں ڈوب گیا کہ جہاں اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ (مسلم ۳۱۹/۲۔ مشکوۃ ۴۳۵/۱)

اس لئے اس بات کا خاص طور پر رشوت میں لیا ہوا نہ ہو۔ قرض لے کے دبایا ہوا نہ ہو ان چیزوں کو اگر آپ صحیح کریں گے تو رمضان المبارک کا مہینہ جو جہنم سے چھٹکارے کا مہینہ ہے اور بخشش کا مہینہ ہے اگر ساری خرابیاں کرتے رہو تو ایسے طور پر اللہ کی طرف سے بخشش کا کوئی وعدہ نہیں۔ جس نبی کی زبان سے ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ اللہ اتنی کثرت کے ساتھ بخشتا ہے تو اسی نبی کی زبان سے یہ اطلاع بھی ہے کہ ایسے ایسے لوگ اس رحمت سے محروم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صحیح طریقے سے، سنت کے مطابق عبادت کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کو حاصل کر سکیں۔

اخر دعوناان الحمد لله رب العالمين ۔

آدابِ معاشرت

بمقام: جامعہ اسلامیہ باب العلوم

بموقع: ہفتہ وار اصلاحی پروگرام

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ " فَقَدقَالَ النَّبِیُّ صَلیَّ اللہ علیہ وسلم لَا تَدخُلُوا الجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْ مِنُوا حَتّٰی تَحَابُّوا اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعلتُمُوہُ تَحَابَبتُم اَفشُوْا السَّلَامَ بَینکُم"

(مسلم. ۵۴/۱ مشکوۃ ص ۳۹۷)

" وَقَالَ النَّبِیُّ صَلیَّ اللّٰہُ علیہ وسلّم اَلمُؤْمِنُ مَاْ لَفٌ وَلَا خَیْرَ فِیْ مَنْ لَا یَاْلَفُ وَلَا یُؤلَفُ " (مشکوۃ. ۴۲۵/۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰالِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

تمہید

یہی دو روایتیں ہیں جو میں نے گذشتہ منگل بھی آپ کے سامنے تلاوت کی تھیں۔ لیکن پچھلے بیان میں بات یہاں تک رہ گئی تھی۔ کہ اپنے بڑوں کا ادب کرو۔ اور اپنے بڑوں کے ساتھ محبت سے پیش آیا کرو۔ اور اپنے دل میں ان کی عظمت پیدا کرو۔ جتنا

- اپنے اساتذہ کے ساتھ۔
- اپنے مشائخ کے ساتھ۔
- اپنے بزرگوں کے ساتھ۔

محبت پیدا کرو گے۔ اور انکی عظمت اپنے دل میں لاؤ گے۔ اتنا ہی اللہ کی رحمت زیادہ ہوگی۔ اور ان کا فیض آپ کی طرف زیادہ منتقل ہوگا۔ اس موضوع پر پچھلے بیان میں آپ کے سامنے کچھ وضاحت ہوئی تھی۔ چونکہ مقصد تو آپ حضرات کو صحیح رستہ دکھانا ہوتا ہے۔ اس لئے سادے سادے الفاظ میں یہ دو چار نصیحتیں ہر ہفتے کر دیتے ہیں۔

علماء کے اچھے تذکرے کی برکت:

بزرگوں سے ایک بات سنی ہوئی ہے۔ اور اپنی اس مختصر زندگی میں کچھ تجربہ بھی ہوا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو یاد رہ جائے تو ایک بات بتادوں۔ ہم نے اپنے اساتذہ سے سنا۔ کہ جس گھر میں علماء کے متعلق اور بزرگوں کے متعلق اچھا تبصرہ ہو۔ اور جو شخص

- علماء کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔
- مشائخ کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔
- اولیاء کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔
- بزرگوں کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔
- اور ہر وقت ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرے۔

تو اول تو اس کی اولاد عالم بن جائے گی۔ اور اگر اولاد عالم نہیں ہوگی تو اس کے پوتے، نواسے ضرور عالم بن جائیں گے۔ (بات یاد رکھیں) میں پھر اس کو دہراتا ہوں کہ جو شخص

- علماء کے ساتھ محبت رکھے۔
- ان کا ادب کرے۔
- ان کا اکرام کرے۔
- گھر میں انکی تعریف کرے۔
- مشائخ کے ساتھ اچھا تعلق رکھے۔
- اچھائی کے ساتھ ان کا ذکر کرے۔
- برائی کے ساتھ ذکر نہ کرے۔

تو بزرگوں نے لکھا ہے اور ان سے ہم نے سنا ہے۔ کہ اول تو اس کی اولاد عالم بن جائے گی۔ اور اگر اس کی اولاد عالم نہیں ہوگی۔ تو اس کے پوتے، نواسے ضرور عالم بن جائیں گے۔

علماء کے برے تذکرے کی نحوست:

ایک تو یہ بات ہوئی ..... دوسری بات .... کہ جو شخص علماء پر تنقید کرے ..... ہر وقت ان کا برائی سے تذکرہ کرے ...... مدارس کا برائی سے تذکرہ کرے .... طلبہ کا برائی سے تذکرہ کرے .... علماء کا مذاق اڑائے .... مولویوں پہ پھبتی کسے .... مشائخ کا احترام اس کے دل میں نہ ہو .... اور اس کی مجلس میں ان کا تذکرہ برائی کے ساتھ ہو۔

اگر ایسا کرنے والا عالم بھی ہو۔ تو اس کے گھر سے اگلی نسل میں علم نکل جاتا ہے ...... جہالت آجاتی ہے .... اس کی اولاد میں کوئی عالم نہیں بنتا...... یہ بات ہم نے اپنے بڑوں سے سنی۔ اور آپ یقین کریں کہ ہم نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس

کے کئی نمونے دیکھ لیے۔ آنکھوں سے دیکھے۔ حالات ہمارے سامنے ہیں۔ کہ جن لوگوں نے علم والوں سے محبت رکھی، ان کے تذکرے اچھے انداز میں کیے، انکی تعریف کی۔ اس گھر میں علم آگیا۔ اور جن لوگوں نے علماء کا ذکر برائی سے کیا، طلبہ کا ذکر برائی سے کیا اور انکی مجلس میں ان کے اوپر پھبتیاں کسی گئیں، اور ان کے عیب نکالے گئے۔ ایسا کرنے والا اگر عالم بھی تھا تو اس کے گھر سے علم نکل گیا۔ اور جہالت آگئی۔

یہ بات سنی ہوئی ہے۔ اور سننے کے بعد تجربہ کی ہوئی ہے۔ اگر میں چاہوں تو آپ کے سامنے دو چار مثالیں ذکر کرسکتا ہوں۔ لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ بس آپ اس اصول کو یاد رکھیے۔

برکت اور نحوست کی وجہ:

اس کی وجہ بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ کہ جب ایک شخص

- اہل علم سے محبت رکھے گا۔
- اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کرے گا۔
- انکی فضیلتیں بیان کرے گا۔
- ان کا نام ادب سے لے گا۔
- محبت کا اظہار کرے گا۔

تو اس کے بچے، اس کی بیوی، گھر میں سننے والے، ان کے دل میں شوق پیدا ہوگا۔ کہ جن کا یہ تذکرہ کررہا ہے کہ وہ ایسے شان والے عالم ہوتے ہیں ...... ان کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے ...... یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے ...... تو بچوں میں بھی عالم بننے کا شوق پیدا ہوگا۔ اور بچوں کے والدین کو بھی شوق پیدا ہوگا کہ بچوں کو حافظ بنایا جائے۔ عالم بنایا جائے۔ اس طرح اگر پہلی نسل عالم نہیں بنے گی۔ تو دوسری نسل عالم ضرور بن جائے گی۔

اور جس وقت گھر میں ان علماء کا برا تذکرہ ہو۔ کہ مولوی ایسے ہوتے ہیں ....

علماء ایسے ہوتے ہیں .... آج کل کے مولوی ایسے ہیں .... آج کل کے مدرسوں میں یہ ہو رہا ہے .... مدرسوں کے طالب علم ایسے برے ہوتے ہیں .... جس گھر میں یوں تذکرہ ہوگا تو جس طرح وہ شخص علماء سے نفرت کا اظہار کرے گا۔ اس کی اولاد کے اندر، اس کے گھر کے اندر بھی اسی طرح سے نفرت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ تو جب علماء سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور بچوں کے دل میں بھی وہی اثرات پیدا ہو جائیں گے۔ تو کون عالم بننا چاہے گا؟

یعنی جس گھر میں عالم کا مذاق اڑایا جا رہا ہو، اس گھر کے بچے عالم بننا چاہیں گے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ بھاگیں گے۔ ان کا نام تک نہیں لیں گے۔ تو جس وقت انکے دل میں نفرت پیدا ہو جائے گی تو عالم کیسے بنیں گے؟۔ اور علم کس طرح سے آئے گا؟

غیبت کی مذمت اور اس کی حقیقت:

اس لئے بزرگ کہا کرتے ہیں۔ کہ غیبت تو کسی کی نہیں کرنی چاہیے۔ غیبت بہت بری بات ہے۔ غیبت کسے کہتے ہیں؟۔ بڑے درجے کے طالب علم تو سمجھتے ہیں۔ چھوٹوں کو سمجھا دوں۔

سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے غیبت کی برائی بیان کی۔ کہ غیبت بڑی بری بات ہے۔ اور اس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔

﴿وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا﴾ (سورہ حجرات. آیت ۱۲)

تم ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو؟۔ کہ تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ۔

تو گویا کہ غیبت کرنا مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ جو قرآن کریم نے کہا۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ

((اَلْغِیبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا)) (مشکوۃ-۱/۴۱۵)

غیبت تو زنا کرنے سے بھی زیادہ بری ہے۔ اتنا اس کے بارے میں تشدد آیا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا

"یارسول اللہ! غیبت ہوتی کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

﴿ذِکْرُکَ اَخَاکَ بِمَا یَکْرَہُ﴾

پس پشت اپنے بھائی کا تذکرہ ایسے الفاظ میں کرنا۔ کہ جب اس بھائی کو پتہ چلے تو اس کو ناگوار گذرے۔ کہ اس نے پسِ پشت میرا ذکر ایسے کیوں کیا؟۔ یہ ہے غیبت۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ "یارسول اللہ! جو عیب ہم اس کا پسِ پشت ذکر کرتے ہیں۔ اگر وہ عیب واقعی اس کے اندر موجود ہو۔ اور ہم سچ بول رہے ہوں۔ تو کیا پھر بھی گناہ ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر واقعی موجود ہو تو یہی تو غیبت ہے۔ اور اگر اس کے اندر عیب موجود ہی نہیں اور تم نے جھوٹ بول کے بیان کر دیا۔ یہ تو غیبت سے بھی بدتر ہے۔ جس کو بہتان کہتے ہیں۔" (مسلم-۲/۳۲۱-مشکوۃ-۱/۴۱۲)

تو بہتان ہوتی ہے جھوٹی بات۔ اور غیبت ہوتی ہے سچی بات۔ کہ واقعتہً اگر ایک شخص کا عیب آپ کو معلوم ہے۔ اور آپ پسِ پشت

- اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔
- اس کو ذلیل کرتے ہیں۔
- اس کو حقیر کرتے ہیں۔
- اس کی برائی کی تشہیر کرتے ہیں۔

چاہے وہ بات سو فیصد ہی سچی ہو۔ تو بھی شریعت نے اس کو "اشد من الزنا" کہا۔ اور قرآن کریم نے اس کو مردے بھائی کے گوشت کھانے کے ساتھ تعبیر کیا۔

مردے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔

یہ غیبت ہر کسی کو حرام ہے .... ہر کسی کی بری ہے۔ کیونکہ یہ آپس میں اختلاف پیدا کرتی ہے........ آپس میں لڑائی کرواتی ہے........ ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلاتی ہے........ بھائی بھائی آپس میں جدا ہو جاتے ہیں........ دوستوں میں جدائیاں ہو جاتی ہیں۔ اس لئے غیبت کے اوپر شریعت نے بہت سخت گرفت کی ہے۔

علماء کی غیبت سب سے زیادہ خطرناک:

لیکن اس کے ساتھ ساتھ۔ (یہ حدیث شریف میں نہیں۔ یہ بزرگ نصیحت کیا کرتے ہیں۔) کہ غیبت ہر کسی کی بری ہے۔ لیکن اہل علم، علماء کی غیبت سب سے زیادہ بری ہے۔ بلکہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کا گوشت زہر آلود ہوتا ہے۔ زہریلا گوشت ہوتا ہے۔ کہ اگر عام گوشت آپ کھائیں تو اتنا برا نہیں۔ لیکن جب آپ زہریلا گوشت کھائیں گے۔ تو حرام کا ارتکاب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی موت کو بھی دعوت دیں گے۔

اس لئے انسان کو علماء کے متعلق زبان احتیاط سے استعمال کرنی چاہیے۔ کبھی کسی عالم کی تحقیر نہ کرے۔ کبھی کسی کی برائی نہ کرے۔ پھر علماء میں سے خصوصیت سے وہ

- جن کے ساتھ آپ کا استادی شاگردی والا تعلق ہے۔
- جن کے سامنے آپ کتاب لے کے بیٹھتے ہیں۔
- جن سے آپ علم جیسی دولت حاصل کرتے ہیں۔
- جن سے آپ فیض حاصل کرتے ہیں۔
- جن کے سامنے آپ گھٹنے ٹیکتے ہیں۔

ان کا ذکر برائی سے کرنا، یہ تو بہت ہی بدتر بات ہے۔ ناشکری بھی ہے، نمک حرامی بھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قاعدے کی خلاف ورزی کی وجہ سے حرام بھی ہے۔

اس لئے اساتذہ کے متعلق کبھی اس قسم کا تذکرہ نہ کرو۔ جس تذکرے کے نتیجے

میں استاذ کی تحقیر ہوتی ہو۔ یا کسی قسم کا اس کی عزت کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس قسم کا تذکرہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہی موضوع تھا جو گذشتہ منگل آپ کے سامنے بیان کیا تھا۔ کہ اگر آپ اساتذہ سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس کے لئے شرطِ اول یہ ہے کہ ان کا ادب کیا کرو، اور احترام سے پیش آیا کرو۔

آگے پیچھے، پسِ پشت جب بھی تذکرہ کرو، ان کی تعریف کرو، ان کیلئے دعائیں کرو، جتنی نسبت آپ ان کے ساتھ لگائیں گے۔ اتنا ہی آپ کا فائدہ ہوگا۔

آپس میں محبت کے ساتھ رہو:

آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے صراحی کی مثال دی تھی۔ کہ صراحی پانی سے بھری ہوئی اور گلاس خالی ہو۔ اور وہ گلاس پانی لینا چاہتا ہے۔ تو صراحی کیلئے ضروری ہے کہ اپنا سر جھکائے۔ صراحی سر جھکائے گی اور گلاس اس کے گلے سے لپٹے گا۔ تو تب جا کے وہ گلاس صراحی کے پانی سے بھر جائے گا۔ اور اگر وہ سر نہیں جھکاتی۔ یعنی بڑے چھوٹے پر شفقت نہیں کرتے، یا چھوٹے ساتھ نہیں لگتے۔ تو پھر فیض حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ یہ تھا مضمون جو میں گذشتہ منگل آپ کے سامنے عرض کیا تھا۔

چونکہ اہم بات تھی۔ اس لئے اس کو دوبارہ تھوڑا سا اور وضاحت کے ساتھ کہدیا اب اس کے بعد

- اپنے ہم سبق ساتھی۔
- اپنے ساتھ مدرسے میں رہنے والے۔
- اپنے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے۔

ان کے ساتھ آپ کا کیا معاملہ ہونا چاہیے۔ یہ آج جو روایت میں نے پڑھی ہے۔ اس میں اس کا ذکر ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں۔

((لَاتَدخُلُونَ الجَنَّةَ حَتّٰی تُومِنُوا))

تم جنت میں نہیں جا سکتے۔ جب تک کہ ایمان نہ لاؤ۔ جنت میں جانے کیلئے ایمان لانا شرط ہے۔ جو شخص مومن نہیں وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ اور پھر فرمایا کہ

((لَا تُؤمِنُوا حَتّٰی تَحَابُّوا))

اور اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہیں۔ جب تک کہ تم آپس میں محبت سے نہ رہو۔ جب تک آپس میں محبت سے نہ رہو، اور آپس میں محبت نہ کرو۔ اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہیں۔

تو ایمان کے کمال کیلئے ضروری ہے۔ کہ مسلمانوں کی آپس میں محبت ہو، تعلق ہو۔ اور پھر فرمایا

((اَلَا اَدُلُّکُم عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُم))

میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتاؤں؟۔ کہ جب تم اس طریقے پر عمل کرو گے۔ تو تمہاری آپس میں محبت ہو جائے گی۔

((اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُم)) (مسلم۔۱/۵۴۔مشکوٰۃ۔۱/۳۹۷)

آپس میں ایک دوسرے کو ''السلام علیکم'' بہت کہا کرو۔

اس سے ایک دوسرے کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہم آپ حضرات سے کہا کرتے ہیں۔ کہ جب کسی کے پاس سے گذرو۔ ''السلام علیکم'' کہہ کر گذرو۔ ہر دفعہ مصافحہ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ کہ جب بھی آپ گذریں۔ مصافحہ کر کے گذریں۔ چلتے چلتے ''السلام علیکم'' کہہ دیا۔ دوسرا ''وعلیکم السلام'' کہے گا۔ ایک دوسرے کے متعلق جب دعا کرو گے۔ تو دعا کے نتیجے میں آپس میں ایک دوسرے کے دل میں محبت پیدا ہوگی۔

یہ نسخہ سرور کائنات ﷺ کا بتایا ہوا ہے۔ اس لئے آپ حضرات کو چاہیے کہ اس نسخے کو استعمال کریں۔ ایک دوسرے کو محبت کے ساتھ ''السلام علیکم۔ وعلیکم السلام'' کی عادت ڈالو۔ اس کے نتیجے میں تمہاری آپس میں محبت ہوگی۔

مومن الفت کی جگہ ہے:

دوسری روایت جو میں نے پڑھی۔ اس کا ترجمہ ہی ہے۔

''اَلْمُؤْمِنُ مَا لَفٌ''مومن سراپا الفت ہوتا ہے۔ بڑے طالب علم سمجھتے ہیں۔ ''مَاْلفٌ'' یہ ''زَیْدٌ عَدلٌ'' کی طرح یہ مبالغہ ہے۔ کہ مومن سراپا الفت ہوتا ہے۔

﴿لَا خَیرَ فِي مَن لَا یَاْلَفُ وَلَا یُؤلَفُ﴾

جو آدمی خود کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یا اس سے کوئی مانوس نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ تو جس میں انس ومحبت نہیں اس میں بھلائی نہیں۔ اور جس میں انس ومحبت ہو۔ یہ علامت ہے خیرا اور بھلائی کی۔

تو آپس میں الفت کے ساتھ رہنا، محبت کے ساتھ رہنا۔ سرورِ کائنات ﷺ نے ایمان کی نشانی بتائی ہے۔ اور آپس کی لڑائی دین کو مونڈ دیتی ہے۔ اور لڑائی اور فساد، اس سے شریعت نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ کہ آپس میں اختلاف کرنا۔ آپس میں لڑنا بھڑنا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ تو ''حَالِقَۃ'' ہے۔ حالقہ کا لفظی معنی ہے۔ مونڈ ڈالنے والی چیز۔ جس کو اہم استرا کہتے ہیں۔ تو آپس کا اختلاف اور آپس کی ضد، یہ تو استرا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا

((لَا اَقُولُ اِنَّهَا تَحلِقُ الشَّعرَ))

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آپس کا اختلاف بال مونڈ دیتا ہے۔

((وَلٰكِنَّهَا تَحلِقُ الدِّینَ))

یہ تو دین کو مونڈ کے رکھ دیتا ہے۔ دین کی صفائی کر دیتا ہے۔ ان لوگوں میں دین نہیں رہتا جن کا آپس میں اختلاف ہوتا ہے۔ جو آپس میں جھگڑے کرتے ہیں۔ جس طرح استرا بال اڑا دیتا ہے۔ آپس کا اختلاف اسی طرح سے انسان کے دین کو خراب کر دیتا ہے۔ (ترمذی۔۲/۱۹۱۔ مشکوۃ۔۱/۴۲۸)۔

کیونکہ .... اختلاف .... جھگڑا .... فساد .... یہ چیزیں ایسی ہیں۔ جن

کے بعد انسان ایک دوسرے سے

- بغض رکھتا ہے۔
- عناد رکھتا ہے۔
- غیبت کرتا ہے۔
- دوسرے کیلئے برائی سوچتا ہے۔

تو انسان دوسرے کے حق میں سراپا برا ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کے اندر خیر د بھلائی باقی نہیں رہتی۔اس لئے آپس کے اختلاف سے بچو۔ اور آپس میں لڑنا بھڑنا ٹھیک نہیں ہوتا۔

لڑائی جھگڑے کی نحوست:

اور یہ بھی حدیث شریف میں ہے۔ کہ اگر مومن کسی دوسرے مومن کے ساتھ ناراض ہو جائے اور اس ناراضگی کے نتیجے میں بولنا چھوڑ دے۔تو طبیعت کی رعایت رکھتے ہوئے۔ تین دن تک تو شریعت نے اجازت دی ہے۔ کہ ٹھیک ہے تمہیں غصہ ہے۔تو آہستہ آہستہ غصہ نکالو۔تو تین دن میں غصہ نکل جائے گا۔تین دن کے بعد آپس میں بول چال چھوڑنا حرام ہے۔تین دن کے بعد آپس میں بولنا ضروری ہے۔

اختلاف اپنی جگہ ، جھگڑا اپنی جگہ ، لیکن بول چال نہیں چھوڑنی چاہیے۔ تین دن کے بعد اگر کوئی شخص آپس میں بولتا نہیں۔ ایک دوسرے کو سلام نہیں کہتے۔ ایک دوسرے سے منہ پھیرتے ہیں۔تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ان کی جتنی نیکیاں ہیں وہ قبول ہونا بند ہو جاتی ہیں۔انکی نیکیاں قبول نہیں ہوتیں۔

جب اللہ تعالی کے دربار میں ان کی نیکیاں پیش ہوتی ہیں تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ''ان کو چھوڑ دو۔ جب تک یہ آپس میں صلح نہیں کرتے۔ انکی کوئی نیکی قبول نہیں''

اور جو خاص خاص وقت آتے ہیں۔ جیسے

- لیلۃ القدر ہو گئی۔

- رمضان المبارک ہو گیا۔

جن میں اللہ تعالیٰ بہت وسعت کے ساتھ لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ ان روایتوں کے اندر صاف ذکر ہے۔

- جن کی آپس میں صلح نہ ہو۔
- جو آپس میں لڑے ہوئے ہوں۔
- آپس میں ضد رکھتے ہوں۔
- آپس میں فساد کرتے ہوں۔

فرماتے ہیں۔ کہ انکی کوئی بخشش نہیں۔ جس وقت تک یہ آپس میں صلح نہیں کرتے۔ تو ان راتوں کی برکتوں سے بھی ان کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ تو ان باتوں کا حاصل یہ ہے کہ آپس میں الفت اور آپس میں انس، یہ ایمان کی علامت ہے۔

محبت کا غلط جگہ استعمال:

اس کے ساتھ ایک اور بات یاد رکھیے۔ لفظِ محبت بہت پاکیزہ ہے۔ یہ ایمان کا مترادف ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کرنے کیلئے کہا۔ اپنے ساتھ محبت کرنے کیلئے کہا۔ آپس میں محبت کرنے کیلئے کہا۔ لیکن اس لفظِ محبت کو اپنی بے وقوفی کے ساتھ اور اپنی غلط سوچ کے ساتھ۔ گندا لفظ نہ بنالیا جائے کہ جس وقت بھی محبت کا لفظ بولا جائے تو ذہن فسق وفجور کی طرف ہی جائے۔ کہ محبت صرف اسی چیز کا نام ہے کہ فسق وفجور کو اختیار کیا جائے۔

یہ اپنی سوچ کی خرابی ہے۔ اس میں لفظ محبت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس لفظ کو اتنا گندا کر دیا گیا کہ جہاں محبت کا تذکرہ آتا ہے۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ ''فلاں کی فلاں سے محبت ہے'' تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے آپس میں غلط قسم کے تعلقات ہیں۔ یہ محبت کے لفظ کو غلط استعمال کر کے لوگوں نے خراب کر دیا۔ ورنہ یہ لفظِ محبت تو بہت ہی

پاکیزہ چیز ہے۔

اس بارے میں میں خصوصیت سے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو ہم سبق ساتھی ہوتے ہیں ان کو آپس میں اس طرح سے رہنا چاہیے۔ کہ

- ایک دوسرے کے ساتھ محبت ہو۔
- ایک دوسرے کے ساتھ الفت ہو۔
- ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہو۔
- ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی ہو۔
- ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کا معاملہ ہو۔
- ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ ہو۔
- ایک دوسرے کے ساتھ نیکی میں تعاون ہو۔
- ایک دوسرے کی غمی، خوشی میں شریک ہوں۔
- ایک دوسرے کے دکھ، درد میں شریک ہوں۔

لیکن یہ محبت ان کو کسی غلط رستے پہ نہ چلائے۔ کہ اس محبت میں آ کے آپس میں گپ شپ میں لگے رہیں اور مطالعہ نہ کریں۔ تکرار ہی نہ کریں۔ سبق میں حاضری نہ دیں۔۔ ہر وقت یہی آپس میں محبت کے قصے ہوتے رہیں۔ یہ محبت کا نقصان ہے جو آپ لوگوں کو پہنچتا ہے۔ اس طرح سے محبت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ آپ اس محبت کے نتیجے میں اپنے پڑھنے، پڑھانے کا نقصان کریں۔ اور آپ کا ذہن، آپ کا دماغ اس طرف لگا رہے۔ یہ جائز نہیں ہے۔

تہمت کی جگہوں سے بچنا اشد ضروری ہے:

اور پھر خاص طور پر ہم عمر ساتھیوں کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ تہمت کے موقع سے بچیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔

((اِتَّقُوا مَوَاضِعَ التُّهَمْ)) (احیاء علوم الدین ۲/ ۲۳۸۔ تفسیر کبیر ۱۲/ ۷۴۔ معناہ صحیح

کشف الخفا ۱/ ۴۴)

تہمت کی جگہوں سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اس قسم کے حالات پیدا ہوں۔ کہ دیکھنے والا سمجھے کہ ان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس سے انسان کو احتیاط کرنی چاہیے۔

میں اور آپ تو کس درجے کے ہیں۔ سرور کائنات ﷺ نے جو سبق پڑھایا۔ وہ سبق یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ حضور ﷺ اعتکاف میں تھے۔ اور مسجد میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن رات کو ملنے کے لیے آجایا کرتی تھیں۔

کیونکہ ملنا تو جائز ہے۔ کہ بیٹھ کے حال چال لے لیا جائے۔ تو مسجد میں آجاتیں۔ تو ایک رات باقی بیویاں فارغ ہو کے چلی گئیں۔ ایک بیوی ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بیٹھی رہ گئیں۔ تو حضور ﷺ بعد میں اٹھے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کو مسجد کے دروازے تک پہنچانے کے لئے آئے۔ جیسا کہ معتکف مسجد کے دروازے تک آسکتا ہے۔

تو جس وقت آپ مسجد کے دروازے تک پہنچانے کے لیے آئے۔ اتنے میں دو آدمی باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے ساتھ کوئی عورت کھڑی ہے۔ تو جلدی سے آگے گذرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ عام لوگوں کا طریقہ یہی ہے۔ کہ ایسے موقع پر جلدی سے انسان آنکھ بچا کے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو انہوں نے بھی جلدی سے نکلنے کی کوشش کی۔ تو سرور کائنات ﷺ نے آواز دے کے ان کو ٹھہرایا کہ

((عَلٰى رِسْلِكُمَا))

ٹھہرو، ٹھہرو، تیزی نہ کرو۔ ذرا سکون اختیار کرو، اور ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور متوجہ کر کے کہا

''هٰذِهٖ صَفِيَّةُ''۔

یہ جو میرے پاس کھڑی ہے۔ یہ میری بیوی صفیہ ہے۔

وہ دونوں بے چارے پریشان ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے؟۔ ہمیں آپ پہ کوئی شبہ تھا؟۔'' آپ نے فرمایا کہ ''اگرچہ اب شبہ نہیں تھا۔ لیکن شیطان تمہارے دل میں یہ وسوسہ ڈال سکتا تھا۔ دل میں خیال لا سکتا تھا کہ پتہ نہیں رات کو کس سے ملاقات ہو رہی تھی؟۔ اور نبی کے متعلق دل میں یہ وسوسہ لانا ایمان کی تباہی ہے۔ اور فرمایا کہ ''شیطان انسان کے اندر اس طرح سے چلتا ہے جیسے خون چلتا ہے''۔ (بخاری۔ ۱/۲۷۲)

وہ تو کسی وقت دل میں خیال لا سکتا ہے۔ اور دل میں یہ خیال آنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی پر بدگمانی ہو جائے اگر اتنا دل میں خیال آجائے کہ پتہ نہیں رات کی تاریکی میں کس عورت سے بات ہو رہی تھی۔ تو یہ بدگمانی آنے کے ساتھ ہی ایمان ختم ہو جائے گا۔

تو سرورِ کائنات ﷺ نے اپنے آپ کو اتنا صاف رکھا۔ کہ ظاہر کر دیا کہ یہ میری بیوی ہے۔ تاکہ کسی کے دل میں یہ خیال نہ آجائے کہ شاید کسی اور عورت سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اس کو کہتے ہیں تہمت اور شبہ سے بچنا۔

تو کبھی بھی دو ساتھی آپس میں ایسے نہ رہیں۔ کہ کسی دشمن کو، کسی بد باطن کو، کسی برا سمجھنے والے کو، یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ

- ان کو مشکوک حالت میں دیکھا گیا ہے۔
- یہ مشکوک حالت میں خلوت میں بیٹھے ہوئے تھے۔
- یہ مشکوک حالت میں بازار کی طرف گئے ہوئے تھے۔
- یہ مشکوک حالت میں باہر سیر کو گئے ہوئے تھے۔

ان کے تعلقات آپس میں ایسے ہیں کہ جن کو دیکھنے کے بعد شک پڑتا ہے کہ ان کے تعلقات آپس میں ٹھیک نہیں ہیں۔ تو اس قسم کے تعلقات رکھنے جائز نہیں ہیں۔

تہمت کے موقع سے بچنا چاہیے۔ تہمت کے موقع سے بچنا یہ بھی ایک اخلاقی فرض ہے۔ اور اپنے آپ کو ایسے حال میں پیش کرنا کہ جس سے دوسرے کے دل میں شبہات پیدا ہوں۔ یہ اپنے آپ کو بے عزت کرنے والی بات ہے۔ اور اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرنے والی بات ہے۔ اور اپنی عزت خراب کرنے والی بات ہے۔

ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ جتنا آپس میں

- اتفاق سے رہو........ اکٹھے کھاؤ۔
- اکٹھے رہو........ اکٹھے کھیلو۔
- اکٹھے بیٹھو........ اکٹھے تکرار کرو۔

ان سب باتوں کی گنجائش ہے۔ اور بدگمانی کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ اٹھنا، بیٹھنا مشکوک قسم کا نہ ہو۔

اگر آپ بدگمانی کا موقع خود فراہم کریں گے۔ تو دوسرے کے دل میں لازماً وسوسہ آئے گا۔ پھر دوسرے کو بولنے کا حق ہوتا ہے، اشارہ کرنے کا حق ہوتا ہے۔

اس بات کی میں نے آپ کے سامنے وضاحت اس لئے کی۔ کہ پچھلے ہفتے ایک چٹ آئی تھی۔ جب میں بیان کر رہا تھا کہ بڑوں کے ساتھ ادب سے رہو۔ محبت سے رہو۔ تو کسی نے چٹ دی تھی۔ کہ ہمیں آپس میں کس طرح سے رہنا چاہیے اسکی وضاحت کریں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کا جواب کسی دوسرے موقع پر دوں گا۔

اس لئے آج میں نے آپ کے سامنے کھل کے یہ مسئلہ بیان کیا۔ کہ آپس میں رہنے کا کیا طریقہ ہے؟۔

اکٹھے کھیلو۔ کھاؤ۔ پڑھو۔ لیکن ایسے حالات نہ پیدا ہونے دو۔ کہ دوسرا آدمی شک کی نگاہ سے دیکھے کہ شاید ان کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔

اور بلاوجہ کسی پہ شک بھی نہ کرو۔ بلاوجہ کسی کے متعلق شک کرنا درست نہیں۔ اگر آپ دوسرے کے متعلق بولیں گے۔ وہ آپ کے متعلق بھی بولے گا۔

آخری بات:

آخری بات ....اور ایک بات اپنے ذہن میں بٹھالو۔بس یہی آخری بات کہتا ہوں۔کہ جس وقت طالب علموں کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں اور آپ بھی اپنے فضائل سن سن کے خوش ہوتے ہیں۔اور آپ بھی آگے بیان کرتے ہیں۔کہ دین پڑھنے والے طالب علموں کے پیروں کے نیچے فرشتے پر بچھاتے ہیں۔اور یہ لفظ آپ بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

اگر چہ یہ تعبیر آپ کی ہے۔حدیث کے یہ الفاظ نہیں ہیں۔حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

((اِنَّ الْمَلٰئِکَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ))

طالب علم کیلئے فرشتے پَر رکھ دیتے ہیں۔وضع کر دیتے ہیں۔

(ترمذی۔۲/۹۷۔۱۹۳۔مشکوۃ۱/۳۴)

وضع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے آپ بازار میں بازو ہلاتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔اور سامنے اچانک آپ کا استاد آگیا۔فوراً ساکن ہو کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔استاد گذر جاتا ہے۔تو پھر آپ چلتے ہیں۔

سائیکل پہ جارہے ہوتے ہیں۔آگے سے استاد آگیا۔تو فوراً آپ سائیکل سے اتر جاتے ہیں۔کھڑے ہو جاتے ہیں۔جب استاد گذر جاتا ہے تو آپ پھر سائیکل پہ چڑھ جاتے ہیں۔

تو یہ جس طرح سے آپ اپنے بڑے کا ادب کرتے ہوئے

- چلنے سے رک گئے۔
- ہاتھ ہلانے چھوڑ دیے۔
- پاؤں ہلانے چھوڑ دیے۔

جب طالب علم آتا ہے تو فرشتے اسی طرح سے ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے

ہیں

- اپنے پر ہلانا چھوڑ دیتے ہیں۔
- اڑنا بند کر دیتے ہیں۔
- اپنی پرواز روک لیتے ہیں۔
- ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کہ پہلے آپ چلے جائیں۔ہم پھر اپنا رستہ لیں گے۔

فرشتے طالب علم کا اتنا احترام کرتے ہیں۔لیکن آپ نے یہ یاد کر رکھا ہے۔کہ فرشتے پاؤں کے نیچے پر بچھا دیتے ہیں،تو بچھا دیتے ہوں تو ہمیں اس میں کیا تکلیف ہے؟۔

لیکن اس شان کو ملحوظ رکھنا آپ کے لیے ضروری ہے۔کہ آپ کی حالت ایسی نہ ہو۔کہ فرشتے تو آپ کے پاؤں کے نیچے پر بچھائے ہوئے ہوں۔اور ہمارا جوتا آپ کے اوپر برس رہا ہو۔تو یہ اپنی شان کو خود خراب کرنے والی بات ہے۔اگر آپ کی شان ایسی ہے کہ فرشتے ادب کرتے ہیں۔تو آپ کو فرشتوں جیسا بن کے رہنا چاہیے۔اور کوئی اس قسم کی حرکت نہ کرو۔کہ جس کے ساتھ آپ کی شان پہ دھبہ آئے۔اپنی شان کو پہچانو۔اور پہچاننے کے بعد اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو۔

سب سے بڑی بات جو تاکید سے کہتا ہوں۔وہ یہ ہے کہ لڑنا بھڑنا نہیں۔بھائیوں کی طرح رہنا ہے۔لیکن ایسے طور پر نہیں رہنا۔کہ کسی کو انگلی اٹھا کے یہ کہنے کی نوبت آئے۔کہ انکے تعلقات اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ایسی صورتحال پیدا نہ ہونے دو۔اور کسی کو بدگمانی کا موقع نہ دو۔خلوت میں،جلوت میں، کوئی ایسی صورتحال اختیار نہ کرو۔کہ دیکھنے والے سمجھیں کہ یہ بداخلاق ہیں۔اس معیار کو بحال رکھیں۔

- تہمت کے موقعوں سے بچیں۔
- بدگمانی کا موقع نہ دیں۔

پھر جس طرح سے چاہیں۔ بھائیوں کی طرح رہیں۔ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو........ بڑوں کو .... چھوٹوں کو........ آپس میں صحیح اور خالص محبت نصیب فرمائے۔ جس محبت کے نتیجے میں پھر اللہ کی محبت ہمارے لئے حاصل ہو جائے۔

وآخر دعواناان الحمد للہ رب العالمین

سوال: طلبہ سے کہیں کہ سلام کا جواب بھی دیا کریں۔ بعض طلبہ سلام کا جواب نہیں دیتے۔

جواب: سلام کہنا سنت ہے۔ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ اگر آپ سلام کا جواب نہیں دیں گے تو گناہ گار ہوں گے۔

سول: سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ آنحضرت ﷺ نبوت ملنے سے پہلے کس نبی کا کلمہ پڑھتے تھے؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ اور کسی غلط بات میں حضور ﷺ کو مبتلا نہیں ہونے دیا۔ باقی تفصیلات ساری وحی کے بعد آئی ہیں۔

سوال: نماز کے دوران منہ سے روٹی کا ذرہ اندر چلا جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے؟

جواب: اگر چنے کی مقدار سے زیادہ ہو تو ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اگر چنے کی مقدار کے برابر ہو یا اس سے کم ہو تو پھر نہیں ٹوٹتی۔

سوال: سجدے کے دوران اگر دونوں پاؤں اٹھ جائیں تو نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب: اگر سارے سجدے میں دونوں پاؤں اٹھے رہیں تو سجدہ نہیں ہوگا۔ جب سجدہ نہیں ہوگا تو نماز نہیں ہوگی۔

سوال: کیا حضور ﷺ نے پرندوں کا شکار کیا تھا یا نہیں؟

جواب: مجھے اس بارے میں کوئی صریح روایت معلوم نہیں۔ ایسے شکار صحابہ رضی اللہ عنہم

کرتے تھے۔ اور شکار کر کے گوشت کھانا۔ حلال رزق حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شکار کرتے تھے۔ اور ہمارے اکابر میں سے اکثر کی عادت شکار کرنے کی تھی۔ اس لئے شکار جائز ہے۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهدان لااله الاانت استغفرك واتوب اليك

راہ استقامت کے راہرو

بمقام: جامعہ ربانیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ

بموقع: تقریب ختم بخاری شریف

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ﴾ (سورہ بقرہ، آیت ۱۵۴)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

دین الٰہی کیلئے ضعفاء کا انتخاب:

سٹیج پر آپ کے سامنے یہ نوجوانوں کے سر کے اوپر جو پگڑی باندھی گئی ہے۔ آپ ان کی شکلوں کو ذرا غور سے دیکھ لیں۔ اگر عقل اور شعور ہے۔ تو آپ ان کی شکلیں دیکھ کے سمجھیں گے کہ یہ دہشت گرد ہیں۔ یا یہ فرشتوں کے برابر اعلیٰ درجے کے انسان ہیں۔ آج پوری دنیا ایک ٹکراؤ میں ہے۔ اور یہ ٹکراؤ ابتداء سے چلا آرہا ہے۔ (ذرا توجہ فرمائیں۔ میں دس پندرہ منٹ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں)۔

حق اور باطل کی جنگ بہت قدیم ہے۔ حق قبول کرنے والے ہمیشہ اللہ کے نام پہ اپنا خون بہاتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ حق میں رونق آتی ہے۔ اور یہ فصل سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جس وقت نبوت کا اظہار فرمایا تھا۔ اور مکہ والوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ آواز سنی تھی۔ تو آپ نے دیکھا کہ

- بڑے بڑے صاحب اقتدار۔
- بڑے بڑے مالدار۔
- معاشرے کے سردار۔
- معاشرے کے چوہدری۔
- معاشرے کے وڈیرے۔

یہ سارے کے سارے مخالف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض مساکین اور ضعفاء کا انتخاب کیا۔ ان ضعفاء میں (آپ کو بھی معلوم ہے کہ) ایک باندی تھی۔ غریب اور مسکین .... جس کا نام سمیہ تھا...... رضی اللہ عنہا...... یہ حضرت عمار کی والدہ تھیں۔ اور حضرت یاسر کی بیوی تھیں۔ ابوجہل ملعون نے ان کے اوپر تشدد کیا۔ اور ایسا تشدد کیا کہ آج جو کچھ آپ کے سامنے...... لال مسجد میں...... جامعہ حفصہ

میں...... موجودہ وقت کے فرعونوں نے اور نمرودوں نے جو حال اہل حق کا کیا ہے۔ اور دین حق کا نام لینے والوں اور قرآن کریم پڑھنے اور پڑھانے والوں کے ساتھ جو معاملہ کیا ہے۔ اس نے بھی ہر کسی کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بہت بڑا ظلم ہے۔ اور تاریخ اسکی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جیسا کہ آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

دور نبوت میں مسلمانوں پر مظالم کی داستان:

لیکن میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے پہ ذرا نظر ڈالیں۔ اور اس کے بعد اہل حق کے ساتھ اس دنیا میں جو کچھ ہوا۔ پچھلی تاریخ کو چھوڑیں

''یَقتُلُونَ النَّبِیّین'' کا واقعہ بڑا لمبا ہے...... کہ لوگوں نے نبیوں کو بھی ناحق قتل کیا۔۔ اور انہوں نے قتل کیا جوان نبیوں کی امت میں سمجھے جاتے تھے۔ وہ بھی اہل کتاب تھے۔ اور یہ انبیاء بھی اہل کتاب کے انبیاء تھے۔ یہ نبیوں کے قتل کا قصہ قرآن میں ہے۔ اس کی اگر تفصیل کی جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ہم اپنی امت کی بات کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے، ان کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔

پہلی امتوں کے مسلمانوں پر ظلم کی داستان:

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اپنی چادر سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ ایک مظلوم مسلمان آیا۔ اور اس نے آ کے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ذکر کیا۔ کہ یا رسول اللہ! مشرکین کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا۔ آپ ان کیلئے بددعا کیجئے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اٹھ کے بیٹھ گئے اور فرمایا۔

''ابھی گھبرا گئے ہو؟۔ اتنی سی تکلیفوں سے ہی گھبرا گئے ہو؟۔ تم سے پہلی امتوں میں اہل باطل نے اہل حق پر اس قسم کے بھی ظلم کیے ہیں۔ کہ ایک کلمہ گو کو پکڑا جاتا تھا۔ اور وقت کے مقتدر لوگ اس کو زمین میں گاڑتے تھے۔ آدھا زمین میں گاڑ دیا۔ آدھا

باہر رہنے دیا۔ آری منگوائی جاتی تھی۔ اور اس زندہ انسان کے سر پر رکھ کر۔ اس کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے۔ یہ تکلیف بھی ان کو دین سے نہ روک سکی۔

اور کبھی ایسے ہوتا تھا کہ اہل حق کو پکڑا جاتا...... پکڑنے کے بعد لوہے کے دندانے لے کر زندہ انسان کے چمڑے کو...... اس کے گوشت کو...... اس کے پٹھوں کو ...... نوچ نوچ کے ہڈیوں سے علیحدہ کر دیتے تھے۔ اور یہ سختی بھی ان کو دین قبول کرنے سے نہ روک سکی۔ اور تم ابھی گھبرا گئے ہو؟۔" (بخاری ۱/ ۵۱۰)

یہ رسول ﷺ ان سے کہہ رہے ہیں۔

- جن کو تپتی ریت پہ لٹایا جا رہا تھا۔
- جن کو انگاروں پہ لٹایا جا رہا تھا۔
- جن کے سینوں پہ پتھر رکھے جا رہے تھے۔
- جن کے پاؤں میں رسیاں باندھ کے گلیوں میں گھسیٹا جا رہا تھا۔
- جن کو صبح شام، رات دن، پیٹا جا رہا تھا۔

ان سے کہا جا رہا ہے کہ ابھی تو تم پر وہ وقت آیا ہی نہیں۔ جو پہلے لوگوں پہ آیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل حق پر ہمیشہ سے اس قسم کے حالات آتے ہیں۔

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے دو ٹکڑے ہو گئے:

میں نے عرض کیا تھا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دین سے روکنے کیلئے۔۔۔ (عورت کی بات ہے، مرد کی بات نہیں ہے) ابو جہل نے ان کے اوپر تشدد کیا۔ اور تشدد کی حد یہ ہوئی۔ دیکھو! آج کسی کو

- گولی مار کے مار دیا جائے........ بہت آسان موت ہے۔
- بم کے ساتھ اڑا دیا جائے........ بہت آسان موت ہے۔
- گلا گھونٹ دیا جائے........ بہت آسان موت ہے۔
- پھانسی پہ لٹکا دیا جائے........ بہت آسان موت ہے۔

لیکن سمیہ کی موت جو ابوجہل کے ہاتھ سے آئی تھی۔ وہ ساری امت کیلئے نمونہ بن گئی۔ (آپ سنتے رہتے ہیں کہ) ایک ٹانگ ان کی ایک اونٹ سے باندھی گئی........اور دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے باندھی گئی........اس اونٹ کو یوں چلا دیا گیا اور اس اونٹ کو یوں (مخالف سمت) چلا دیا گیا۔ اور سمیہ رضی اللہ عنہا کے دوٹکڑے ہو گئے۔

(روح المعانی ۱۴/۲۲۷)

آپ ذرا اس موت کا تصور کریں۔ جس قسم کی موت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دی گئی اس اللہ کی بندی نے سب کچھ برداشت کرلیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن جو تھا ما تھا۔ اس کو نہیں چھوڑا۔

انگریز نے مجاہدین پر کیا ظلم کیے:

اس کے بعد (لمبی تاریخ میں میں نہیں جاتا) جب ہندوستان میں انگریزوں کا دور آیا ہے۔ یہاں سختیاں ہمیشہ انہیں پہ ہوا کرتی ہیں (توجہ فرمائیں۔ اور یہ پگڑیاں بندھوانے والے بھی ذرا خیال کرلیں) ہمیشہ سختیاں ان لوگوں پہ ہوتی ہیں۔ جو مذہب کے ترجمان ہوتے ہیں۔ عوام کے قائد ہوتے ہیں۔ انہیں کے حوصلے کے ساتھ عوام میں دین کا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ قربانی دیتے ہیں تو لوگوں کا ایمان محفوظ رہتا ہے۔ دنیا اس بات کو سمجھتی ہے۔ ہم اس بات کو نہیں سمجھتے۔

- جب تک علماء باقی ہیں........ تو علم باقی ہے۔
- علم باقی ہے........تو قرآن وحدیث باقی ہیں۔
- قرآن اور حدیث باقی ہیں........تو مسلمان باقی ہے۔

مسلمان قوم کو اس طرح نہیں قتل کیا جاسکتا۔ جس طرح فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر کے ختم کرنا چاہا تھا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان کو ختم کیا جاسکتا ہے تو علماء کو ختم کرنے کے ساتھ ختم کیا جاسکتا ہے۔

تو انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا۔ مجاہدین کو..اور خاص طور پر اہل علم کو۔ چن چن کے پکڑا...چاندنی چوک دہلی میں ان کیلئے مقتل قائم کیا، قربان گاہ قائم کی ....قطاروں کے اندر مجاہدین کھڑے ہوتے تھے ....اور ادھر توپ فٹ تھی۔ ایک مجاہد کو لایا جاتا۔ اور سامنے کھڑا کر کے گولے کے ساتھ اس کو اڑایا جاتا۔

❀ ہاتھ کہیں جا رہا ہے۔
❀ سر کہیں جا رہا ہے۔
❀ پیر کہیں جا رہا ہے۔

سب کے سامنے اس کے یوں ٹکڑے اڑ جاتے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے کلام میں یہ بات ہے۔ کہ تاریخ میں جھوٹ بولنے کیلئے بھی ایک مجاہد ایسا نہیں۔ جس نے یوں کہہ کر معافی مانگی ہو۔ کہ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ (اللہ اکبر)

سب آنکھوں کے سامنے یوں ایک دوسرے کو اڑتا ہوا دیکھتے تھے۔ لیکن وہ قربانی کے بکروں کی طرح قربان ہو گئے۔ انگریز کے سامنے جھکے نہیں۔ اور اپنے اس کردار کے اوپر کسی قسم کے افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ یہ آپ کے اسی ہندوستان کے واقعات میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔

مجاہدین کے ہولے:

۱۸۵۷ء میں جو جہاد ہوا تھا۔ اس کے سو سال بعد ۱۹۵۷ء میں جب یہاں جنگ آزادی کی یاد میں جلسے کیے گئے۔ میں اس وقت قاسم العلوم میں مدرس تھا۔ اور وہاں اس بارے میں بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ اور ان دنوں میں شورش کاشمیری بہت واقعات لکھا کرتا تھا۔

چٹان (رسالے) کے اندر اس وقت کے واقعات کی تصویریں اس نے دی تھیں۔ کتابوں میں ہم نے یہ پڑھا تھا۔ یہ چنے کے ہولے جو کرتے ہیں۔ یہ تو آپ

جانتے ہوں گے۔ آگ جلا کر اس کے اوپر چنے رکھے جاتے ہیں اور بھونے جاتے ہیں اور بڑے لذیز ہوتے ہیں ہندوستان میں تو بہت رواج تھا اور یہاں میرا خیال ہے چنے ہوتے نہیں ہیں۔ اس لئے ہولے کرنا شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو۔ تو اس نے چٹان میں دکھایا تھا کہ اس انگریز نے مجاہدین کے ساتھ۔ علماء کے ساتھ درختوں کے اوپر لٹکا کے۔۔ ایک ہاتھ اودھر باندھا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ ادھر باندھا ہوا ہے۔ لٹکائے جاتے، اور نیچے آگ جلا کر ان کو اس طرح سے بھونتے تھے۔ جس طرح سے ہولے کئے جاتے ہیں۔

لٹکے ہوئے مجاہدین کی انہوں نے تصویریں دکھائی تھیں۔ کہ اس طرح سے انہوں نے مارا۔ ایک مجاہد عالم کو پکڑا جاتا۔ پکڑنے کے بعد، پکتا ہوا تیل، جس طرح سے آپ پکوڑے تلتے ہیں، بیسن ڈالتے ہیں تو جلدی جلدی وہ پک جاتا ہے۔ تو پکتے ہوئے تیل کے کڑاہوں میں زندہ انسانوں کو پکڑ کے ڈال دیتے۔ اور ان کے

- چمڑے علیحدہ ہو جاتے۔
- گوشت علیحدہ ہو جاتا۔
- ہڈیاں علیحدہ ہو جاتیں۔

اس طرح کے مظالم اس ہندوستان میں علماء کے اوپر ہوئے ہیں اور آسمان اور زمین نے وہ دیکھے ہیں۔ تو یہ تاریخ کا ایک تسلسل ہے جو چلا آ رہا ہے۔ تو اس لئے یہ علماء جو تیار ہوتے ہیں۔ ان کو آپ صرف یہ نہ سمجھیں کہ اب یہ علماء بن گئے۔ ان کا کام صرف اپنی عزت کروانا ہی ہے۔ یا یہ صرف مولانا کہلائیں گے .... نہیں ..... یہ تو قربانی کے بکرے بھی ہیں۔

یہ قوم قربانی کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اور جس کو قربانی کیلئے تیار کیا گیا ہو۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ اس کا امتحان اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اگر وہ پیٹھ پھیر جائے تو وہ اپنے منصب سے غداری کرتا ہے۔

خالصتاً اللہ کے مال پر پلنے والے:

یہ میں کیوں کہہ رہا ہوں؟ کہ قربانی کیلئے تیارر کیے گئے ہیں۔

- کوئی شخص اپنی ضروریات پوری کرتا ہے دکان سے۔
- کوئی اپنی ضروریات پوری کرتا ہے کاشتکاری سے۔
- کوئی اپنی ضروریات پوری کرتا ہے مزدوری سے۔
- کوئی اپنی ضروریات پوری کرتا ہے ملازمت سے۔
- کوئی اپنی ضروریات پوری کرتا ہے نوکری سے۔
- کوئی اپنی ضروریات پوری کرتا ہے کسی اور پیشے سے۔

رزق اللہ دیتا ہے۔ لیکن اس شخص کے سامنے ایک وسیلہ ہے۔ جو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ اور اس واسطے کے ساتھ وہ اللہ کا رزق حاصل کرتا ہے۔ اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔

لیکن یہ قوم ایک ایسی قوم ہے کہ جنہوں نے رزق خالصتاً براہ راست اللہ سے لیا ہے۔ درمیان میں واسطہ کوئی نہیں۔ اللہ کے نام پر پیسے آتے ہیں۔ اللہ کے نام پر چندہ آتا ہے۔ اور ان کی ساری ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ خالصتاً اللہ کے مال پر پلتے ہیں۔ جب اللہ کے نام پہ پلتے ہیں۔ تو اپنے سر کی قیمت۔ اپنے بدن کی قیمت یہ کھائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے

- جب بھی موقع آئے......سر دینے کا۔
- جب بھی موقع آئے......جان لٹانے کا۔
- جب بھی موقع ئے......خون بہانے کا۔
- جب بھی موقع آئے......قربانی دینے کا۔
- جب بھی موقع آئے......سر کٹوانے کا۔

تو سب سے پہلے ان کے اوپر فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ دین کی خاطر ڈٹ جائیں

اور اپنا خون بہا دیں۔ اور جو اللہ کے نام پہ کھایا پیا ہے۔ اس کو حلال کر کے دکھائیں۔ تو ان کے اوپر یہ ذمہ داری آتی ہے۔ اور الحمد للہ اس ذمہ داری کو ہر دور میں علماء نے اداء کیا ہے۔

اور جب کسی کو قربانی کیلئے تیار کیا گیا ہو وہ قربانی کے موقع پر اگر پیٹھ پھیر جائے۔ تو یہ بہت بڑی غداری ہوتی ہے۔ ہم لوگ۔ علماء، طلباء ہم سارے کے سارے دین کیلئے قربانی کے بکرے ہیں۔ جب اللہ کے نام پر ضرورت پیش آئے گی تو اس طبقے کا کام ہے۔ کہ لوگوں کے ایمان کو بچانے کیلئے، لوگوں کے ایمان کو محفوظ کرنے کیلئے اپنی جان دیں، اپنی جان قربان کریں۔ یہ ان کا فرض ہے۔ اگر یہ ایسا کرتے ہیں تو اپنا فرض اداء کرتے ہیں۔ اور جو ڈر گیا........ دب گیا........ پھر گیا........ جھک گیا........ بھاگ گیا........ وہ یوں سمجھو کہ جتنا کچھ اس نے اللہ کے نام پر کھایا تھا اس نے سارا حرام کیا ہے۔

طلبہ ہر وقت قربانی کیلئے تیار رہیں:

اس لئے طلباء کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ کسی وقت بھی نوبت آسکتی ہے۔ تو آپ اللہ کیلئے جان قربان کیلئے صفِ اول کے مجاہد ثابت ہوں۔ اس بارے میں کوئی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ امریکہ تمہیں دہشت گرد کہے، میں کہتا ہوں وہ صحیح کہتا ہے۔ کیونکہ آپ ان کے لیے دہشت گرد ہیں۔ اس لئے وہ ٹھیک کہتا ہے۔ وہ تو خواب میں بھی تم سے ڈرتے ہیں۔ جب تمہاری شکل ان کو نظر آتی ہے۔ تو خواب میں بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ تو پھر وہ تمہیں دہشت گرد نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟۔

داڑھی والوں کی دہشت کافروں پر:

مجھے میرے ایک دوست نے بتایا۔ کہ انگلینڈ میں عورتیں آتی ہیں۔ بسا اوقات ان کے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں عورتیں آتی ہیں تو بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور چونکہ وہاں گھر گھر میں ٹی وی دیکھتے ہیں۔ اور ٹی وی کے اندر ان کو

اسامہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ بڑی بڑی اس کی داڑھی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ کئی دفعہ ایسا ہوا۔ کہ ایک عورت کے ساتھ بچے جا رہے ہیں۔ آگے سے کوئی داڑھی والا آ گیا۔ تو .... بن لادن .... بن لادن .... کرتے ہوئے بچے دوڑ کے اپنی ماں سے لپٹتے ہیں۔ جس طرح مرغی کے بچے دوڑ کے مرغی کے پروں کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ تو پھر وہ تمہیں دہشت گرد نہ کہیں تو کیا کہیں؟

تم ان کا مطلب سمجھو۔ یہ ہمارے بے عقل لوگوں نے سمجھ لیا کہ شاید آپ فی الحقیقت دہشت گرد ہیں۔ یہاں مدرسہ ہے۔ یہاں طلبہ رہتے ہیں۔ مجھے بتاؤ! آج سے ۵۷ یا ۵۸ سال پہلے، میں اس مدرسے میں پڑھتا رہا۔ میں اور مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ جامعہ امدادیہ والے اور مولانا عبدالمجید انور ہم تینوں ساتھی تھے۔ ایک ہی جماعت کے تھے۔ یہاں میری تعلیم کا آغاز ہوا ہے۔ اس وقت دو چار کچے سے کمرے ہوتے تھے۔ یہ سارا میدان خالی تھا۔ میں نے سائیکل چلانا اسی میدان میں سیکھا ہے۔ یہ آج سے کم از کم ۵۸ یا ۵۹ سال پہلے کی بات ہے۔ پاکستان کے ایک آدھ سال کے بعد۔ جس سال میں یہاں پڑھنے کے لیے داخل ہوا تھا۔ اس سال اس مدرسے میں دورہ حدیث شریف کی پہلی جماعت تھی۔ جس میں حافظ محمد حنیف صاحب اور مولانا فضل کریم صاحب کے بیٹے مولانا عبدالکریم یہ دو طالب علم ہوتے تھے۔ گویا کہ مدرسہ سات، آٹھ سال پہلے سے تھا۔

علماء دہشت گرد نہیں ہیں:

تو ستر سال اس مدرسے کو ہو گئے۔ پورے کے پورے علاقے میں سے کوئی ایک آدمی کہے کہ یہاں کے کسی طالب علم نے یا کسی استاذ نے کسی جگہ دہشت گردی کی ہو۔ تو ستر سال کا تو تمہارا مشاہدہ ہے کہ یہ دہشت گرد نہیں ہیں۔ اور ٹی وی کے اوپر کوئی بھونک دیتا ہے تو تمہیں بھی شبہ پڑ جاتا ہے کہ شاید یہ مولوی دہشت گرد ہیں۔ اور ان دین بیزار لوگوں کی بات سن کے اپنے ستر سال کے مشاہدے کو بھول جاتے ہو۔ جب

وہ ٹی وی کے اوپر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو ہمارے بعض نوجوان بھی سوچنے لگ جاتے ہیں۔ کہ شاید یہ مولوی واقعی دہشت گرد ہیں۔ بش صاحب جو کہتے ہیں۔ بس بش صاحب کا کہنا ایک قسم کی وحی بن گیا۔ تو تم کبھی گریبان میں منہ ڈال کے دیکھو۔

- ہر شہر کے اندر مدرسے ہیں۔
- ہر شہر کے اندر طلباء ہیں۔
- ہر شہر کے اندر علماء ہیں۔

کیا کہیں ان سے کوئی دہشت گردی کا واقعہ پیش آیا ہے؟۔ لیکن ان کے کہنے پر تمہارے دلوں میں بھی شبہات آجاتے ہیں۔ کہ شاید یہ واقعی دہشت گرد ہی ہیں۔

لال مسجد پر دہشت گردی:

دہشت گردی یہ ہے جو اسلام آباد میں ہوئی۔ اور اس کے بارے میں صحیح کیا ہے؟۔ غلط کیا ہے؟۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب امریکہ کی طرف سے اعلان آگیا کہ

''یہ جو کچھ ہوا ہے۔ ہمارے کہنے سے ہوا ہے''

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہے؟ (پڑھا ہے۔ مجمع)۔ تو اس نے اعلان کیا کہ جو کچھ ہوا ہے ہمارے کہنے سے ہوا ہے اور یہ دہشت گردی کے خلاف کوشش کا ایک حصہ ہے۔ اب بش کے کہنے پر جو کام ہو۔ اس کے حق ہونے اور اس کے صحیح ہونے کی وجوہات آپ کیا تلاش کرتے ہیں؟۔ اور جو اس میں مارے گئے۔ انکی شہادت کے بارے میں آپ کو کیا شبہ ہے؟۔

وہ تو بش نے اور امریکہ نے کہدیا کہ ہمارے کہنے پہ ہوا۔ اس کے بعد فیصلہ بہت آسان ہے کہ جو کچھ ہوا ہے یہ۔

- کفر کو خوش کرنے کیلئے ہوا ہے۔
- دشمن کو خوش کرنے کیلئے ہوا ہے۔

- امریکہ کو خوش کرنے کیلئے ہوا ہے۔

خدائی شہادت:

حق نمایاں ہو گیا لیکن یہ ہونے کے بعد۔ ان کی قبروں سے خوشبو کا آنا۔ اور ان کی قبروں سے قرآن کے پڑھنے کی آوازوں کا آنا۔ کیا یہ اللہ کی طرف سے اس بات کی شہادت نہیں ہے؟۔ کہ یہ لوگ میرے لیے مرے ہیں۔ (اللہ اکبر.... نعرہ تکبیر.... اللہ اکبر)

- اب اللہ کی گواہی یہ ہے کہ یہ میرے لیے مرے ہیں۔
- امریکہ کہتا ہے کہ میں نے کہہ کے مروایا ہے۔

اب اس کے بعد حق اور باطل کا فرق کرنا کتنا مشکل رہ گیا ہے؟۔ اس لئے کوئی شخص ان کے متعلق زبان وارزی نہ کرے۔ اور اپنے ایمان کو خراب نہ کریں۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا۔ ایک جذبے کے تحت کیا۔ ہم کہتے ہیں۔ "اللہ ان کے جذبے کو قبول فرمائے"۔ اور یہ اسی طرح سے ان شاء اللہ ظالموں کے زوال کا ایک نمونہ بن گئے۔
امد اہل حق کے ولولے اس سے پیدا ہو گئے۔ کیونکہ یہ اسلام کی خاصیت ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے۔
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبادیں گے۔

میں تو چاروں طرف آتے جاتے دیکھتا ہوں، معلوم کرتا ہوں، کہ اس واقعہ کے بعد..... علماء..... طلباء..... عوام..... سب کے جذبات نمایاں ہو گئے۔ اور اس ظالم کے ظلم کا جو انجام ہونے والا ہے۔ وہ ان شاء اللہ العزیز آپ لوگوں کے سامنے آجائے گا۔ کہ یہ کنارے پہ آگئے ہیں۔ اب یہ ان شاء اللہ کھسکتے چلے جائیں گے۔

آخر کار فتح اسلام کی ہو گی:

باقی ایک بات میری خوب اچھی طرح سے یاد رکھیے۔ ذہن نشین کرلیں جب تک جنگ جاری ہو۔ اس وقت تک جیت ہار کا فیصلہ نہیں ہوا کرتا کسی محاذ پہ کوئی شکست

کھا گیا۔ کسی محاذ پہ کوئی فتح پا گیا۔

شکست اور فتح کا پتہ چلا کرتا ہے۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد۔ ابھی تو یہ جنگ کا تسلسل ہے۔ جنگ جاری ہے

- افغانستان میں جاری۔
- فلسطین میں جاری ہے۔
- چیچنیا میں جاری ہے۔
- عراق میں جاری ہے۔
- پاکستان میں بھی کسی نہ کسی انداز میں جاری ہے۔

اس میں کوئی شہید ہو جائے۔ کوئی غالب آجائے۔ یہ فیصلے کی بات نہیں ہوتی۔ فیصلہ اس وقت ہوگا جب جنگ ختم ہوگی۔ اور لوگ اپنے ہتھیار رکھ دیں گے۔

اس کے بارے میں الصادق المصدق سرور کائنات کا اعلان سن لو۔ آپ نے فرمایا (اور بالکل سچ فرمایا۔ ہمارا ایمان ہے۔ اور ہم اس وقت کے لیے دوڑے جا رہے ہیں۔ دشمن کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے) "ایک وقت اللہ کی جانب سے آئے گا۔ کہ یہ یہود جو آج ساری دنیا کے اندر خون ریزیاں کر رہے ہیں۔۔ نہ ان کو درخت پناہ دیں گے۔ نہ ان کو پتھر پناہ دیں گے۔ اگر یہ پتھر کے پیچھے چھپیں گے تو پتھر آواز دے گا

"یَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِيْ اُقْتُلْهُ"

اے مسلم! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے۔ آ کے اس کو قتل کر دے۔ اور اگر یہ درخت کے پیچھے چھپیں گے تو درخت آواز دے گا

"يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِيْ اُقْتُلْهُ"

یہ جنگلوں میں مارے جائیں گے۔ پہاڑوں میں مارے جائیں گے۔ حتیٰ کہ یہودیت، نصرانیت ختم ہو کے صرف اسلام کا جھنڈا لہرائے گا۔ (بخاری۔ ۱/۴۱۰۔ مشکوۃ ۱/۴٦٦)

روم وفارس سے ٹکرانے والے مسکین:

باقی تم سوچو گے کہ سارے کا سارا اسلحہ تو انکے پاس ہے۔ ساری کی ساری قوت ان کے پاس ہے۔ مسلمانوں کے پاس تو کوئی چیز بھی نہیں۔ یاد رکھنا! یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں جس وقت جماعت قائم کی تھی۔ کیا پوزیشن (Position) تھی؟۔

- تلواروں کے اوپر نیام بھی نہیں تھے۔
- کھانے کے لئے روٹی نہیں تھی۔
- چوبیس گھنٹے میں ایک کھجور ملتی تھی۔
- بسا اوقات وہ بھی نہیں ملتی تھی
- پتے کھانے پڑتے تھے۔
- سفر کرنے کیلئے سواریاں نہیں تھیں۔

اور اس وقت۔ دونوں طرف دو عظیم سلطنتیں تھیں۔ جیسے آپ نے دیکھا روس اور امریکہ۔ تو اس وقت بھی دو سلطنتیں تھیں۔ ایک فارس کی اور ایک روم کی۔ تو کیا تم تاریخ بھول گئے؟۔ کہ دونوں سلطنتیں انہیں مسکینوں نے ختم کی تھیں۔

- جن کے پاس کھانے کے لیے روٹی نہیں تھی۔
- جن کی تلواروں کے نیام نہیں تھے۔
- جن کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے تھے۔
- جن کے جوتے پھٹے ہوئے ہوتے تھے۔

یہی مساکین کی جماعت فارس کو کھا گئی۔ یہی روم کو کھا گئی۔ جیسے وہ دو سلطنتیں ان مسکینوں نے ختم کی تھیں۔ اور دنیا کو ظلم سے نجات دلائی تھی۔ اللہ نے وہی تاریخ دھرائی ہے۔ دنیا دو بلاکوں میں بٹی۔ امریکہ اور روس۔ پہلے اس سرخ ریچھ (روس) کی ٹانگیں بھی انہیں مسکینوں نے توڑیں۔ اور اس وقت جب روس مرا تو یہ دوسرا بندر ناچتا ہوا

مقابلے میں آ گیا۔ روس تو بیس سال نکال گیا تھا۔ ان کے تو ابھی چار پانچ سال گذرے ہیں۔ ابھی سے ہوا نکلی ہوئی ہے۔ یہ ناچتا ہوا بندر بھی بھاگنے والا ہے۔ فکر نہ کریں۔

دنیا دیکھے گی۔ کہ یہی مساکین روس کے فاتح ہیں۔ اور یہی مساکین امریکہ کے فاتح ہیں۔ اگر ان سؤروں اور بندروں سے جان چھوٹنی ہے تو انہی علماء اور طلباء کی وساطت سے چھوٹنی ہے۔ اور انسان دیکھ لیں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے اندر کتنی قوت رکھی ہے۔ اور جب انسان اللہ کی خاطر قربان ہونے کیلئے تیار ہو جایا کرتا ہے۔ تو

- کوئی طاقت اس کو شکست نہیں دے سکتی۔
- کوئی قوت اس کو جھکا نہیں سکتی۔
- کوئی طاقت اس کو دبا نہیں سکتی۔
- کوئی قوت اس کو اپنے مشن سے ہٹا نہیں سکتی۔

آپ حوصلہ بلند رکھیں اس قسم کے واقعات دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ اور طلباء کو میں کہتا ہوں کہ آپ اپنے اس منصب کو ذہن میں رکھیں۔ ساری زندگی آپ نے دین کے لیے لڑنا ہے۔ دین کے لیے کام کرنا ہے۔ اور جس وقت اللہ کے دین کیلئے کوئی وقت آ جائے تو قوم کی قیادت آپ لوگوں نے کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور ان جوانوں کو بھی اپنے دین کیلئے قبول فرمائے۔ ہمارے لئے یہ بہت بڑی سعادت ہے۔ اس قسم کے واقعات سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔

- اللہ کی شہادت ہے کہ وہ قبول ہیں۔
- امریکہ کی شادت ہے کہ میرے مقتول ہیں۔

امریکہ کا مقتول یقیناً شہید ہے۔ اور اللہ کی شہادت نے ان کا منصب واضح کر دیا۔

ہم اپنا وزن ان کے حصے میں ڈالتے ہیں۔ اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ کہ اللہ ان کی قربانی قبول فرمائے۔ اور جوان کے قاتل ہیں۔ اگر ان کی قسمت میں ہدایت

ہے۔ تو ان کو اللہ ہدایت دے دے۔ ورنہ ان کا ایسا عبرت ناک انجام ہو جیسا کہ عاد وثمود کا ہوا۔ تب جا کے اہل ایمان کے دل ٹھنڈے ہوں گے۔

ظلم کی انتہاء

اس لئے کہ صرف یہ نہیں۔ بلکہ ایک بات اور یاد رکھیں۔ انہوں نے طلبہ اور علماء کی تحقیر کی۔ یا طالبات کے ساتھ زیادتیاں کیں۔ صرف یہ نہیں۔ آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا۔ قرآن کریم کے نسخے۔۔ اللہ کی کتاب کے نسخے جن کو مسلمان چوم چوم کے سر پہ رکھتا تھا۔ وہ سارے اکٹھے کر کر کے انہوں نے گندے نالے میں پھینکے ہیں۔

قرآن کریم .... حدیث شریف .... دینی کتابیں .... جتنی تھیں .... پتہ نہیں .... کس قسم کے انسان تھے؟۔ مسلمان تو بہر حال نہیں تھے۔ جنہوں نے یہ حرکت کی ہے۔ کہ قرآن کریم کی اس طرح سے توہین کی۔

- قرآن کے اوراق گندے نالوں میں پھینکے۔
- ان شہداء کی لاشیں گٹروں کے اندر پھینکیں۔
- ان مظلوموں کو آگ کے اندر جلا دیا۔

یہ سارے کے سارے مظالم انہوں نے کیے۔ کہتے ہیں۔

"اللہ کے ہاں دیر تو ہے۔ اندھیر نہیں"

پتہ نہیں کب تک ڈھیل ہے۔ اور وہ بھی شاید اسی وجہ سے ہے کہ یہ درویش دعائیں کرتے ہیں۔ کہ

- یا اللہ! اس ملک پہ رحم فرما۔
- یا اللہ! اس ملک کی حفاظت فرما۔
- یا اللہ! اس ملک کے اندر امن قائم فرما۔

شاید یہ بچاؤ بھی انہیں کی دعاؤں سے ہے۔ اسی قرآن وحدیث کی برکت سے ہے۔ ورنہ جو اسلام کے نام پر ملک لیا گیا تھا۔ جب اس کے اندر اسلام کا یہ حال ہو۔ تو

اس ملک کے باقی رہنے کا جواز کیا ہے؟۔ یہ اگر باقی ہے تو بھی انہیں درویشوں کی برکت سے باقی ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں۔ توبہ بھی کریں۔ اور ظالموں سے نجات کی دعا بھی کریں۔ اور ان مغفورین کیلئے رفع درجات کی دعا کریں۔ کبھی بھی زبان سے ان کے اوپر تنقید نہ کریں۔ یہ تنقید ہمارے اپنے حال کو خراب کرے گی۔ وہ تو اپنا وقت جیسے تھا گذار گئے۔ چونکہ حالات صحیح طور پر ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے ہم بیٹھ کے تجزیہ کیسے کر سکتے ہیں۔ کہ فلانے کی اتنی غلطی تھی۔ فلانے کی اتنی غلطی تھی۔ اگر واقعات تفصیلاً سامنے ہوتے پھر تو شاید کسی بات کی گنجائش ہوتی۔ اب تو پتہ نہیں ہوا کیا ہے؟۔ کس طرح سے ہوا؟۔ اور یہاں تک نوبت کیسے آ گئی؟

اس لئے اس بارے میں خاموشی اختیار کرو۔ بات کرنی ہے تو ان کی قربانی کا تذکرہ کر کے اپنے ولولے اجاگر کرو۔ باقی تنقید کی زبان استعمال کر کے اپنے ایمان کو خراب نہ کریں۔

شہادت کی تمنا:

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی موقع دے۔ میں تو خود صبح شام اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کے دعا کرتا ہوں۔

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی شَهَادَةً فِی سَبِیلِكَ"

یا اللہ! مرنا تو ہے۔

- لوگ موٹر سائیکل سے گر کر مرتے ہیں۔
- بسوں کے نیچے آ کے مرتے ہیں۔
- ریل گاڑی کے نیچے آ کے مرتے ہیں۔
- ایکسیڈنٹ کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔
- نہروں میں نہاتے ہوئے ڈوب کے مرتے ہیں۔
- دریاؤں میں نہاتے ہوئے ڈوب کے مرتے ہیں۔

- ذرہ ذرہ سے جھگڑے پر ایک دوسرے کا پیٹ پھاڑ دیتے ہیں۔

موت تو ہر کسی کو آنی ہے۔ موت کیلئے تو کوئی عذر کی بات ہی نہیں۔

- جنازے صرف جھونپڑیوں سے نہیں اٹھتے۔ محلوں سے بھی اٹھتے ہیں۔
- صرف میدانوں سے نہیں نکلتے.... قلعوں سے بھی نکلتے ہیں۔۔

مرنا تو لازما ہے۔ تو اللہ تعالیٰ موت ایسی تو دے۔ جس پر اللہ کی رحمت ہو اور اللہ کہے۔ یہ موت نہیں۔ یہ حیات ہے۔ ایسی موت اللہ نصیب فرمائے۔

دعا ہے کہ اللہ اس مدرسے کو آباد کرے اور دن دگنی، رات چوگنی ترقی دے یہ مدرسے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ جن میں آکے آپ کو اس قسم کی دین کی بات سننے کا موقع مل جاتا ہے۔ جو آپ کے ایمان کی تازگی کا باعث بنتا ہے۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهدان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك.

سازشی ٹولہ

بمقام: جامعہ دار القرآن فیصل آباد

بموقع: تقریب ختم بخاری شریف

خطبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ.

اَمَّا بَعْدُ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ. (بخاری رقم ۷۵۶۳)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ. وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ وَنَحْنُ عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشَّاھِدِیْنَ وَالشَّاکِرِیْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ وَعَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی عَدَدَ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ

❀❀❀❀❀

تمہید

پہلے سے ہی معمول کچھ اس طرح سے چلا آ رہا ہے۔ کہ ختم صحیح البخاری کے عنوان سے جو مجمع ہوتا ہے۔ اس میں عوام کی خاصی تعداد موجود ہوتی ہے۔ اس مجمع میں اگر اس درس کی گفتگو کو فنی اصطلاحات میں ہی بند رکھا جائے۔ تو طلبہ تو یقیناً فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور علماء کے سامنے کوئی جدید معلومات نہیں آتیں۔ کیونکہ ہر سال وہی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ لیکن عوام کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ صرف ایک تبرک سمجھ کے مجلس میں بیٹھے رہتے ہیں۔

اس بات کو محسوس کرتے ہوئے اللہ کی توفیق سے ہر موقع پر تمہیدی کلمات میں کچھ عوام کے لیے فائدے کی باتیں بھی کر دی جاتی ہیں۔ تا کہ وہ یہاں سے یہ احساس لے کے نہ اٹھیں کہ علماء کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس ضرورت کے تحت دو چار باتیں آپ کی خدمت میں اس درس حدیث سے پہلے عرض کرتا ہوں۔

مایوسی کافروں کا کام ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے یہ بات نقل فرمائی ہے۔ بات یعقوب علیہ السلام کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کو نقل فرمایا ہے۔ کہ یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا۔

"لَا تَيْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ" (سورہ یوسف آیت ۸۷)

موقع محل کے مطابق اس کا معنی یوں ہے کہ بیٹو! یوسف کی تلاش جاری رکھو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوؤ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کافروں کا کام ہے۔ مؤمن ہمیشہ اللہ کی رحمت کا امیدوار رہتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں بعض بعض مواقع ایسے آیا کرتے ہیں۔ کہ ڈر ہوتا ہے کہ

کہیں عمومی طور پر،

- قوم کے حوصلے نہ ٹوٹ جائیں۔
- قوم کسی مرعوبیت کا شکار نہ ہو جائے۔
- ان کے اوپر اپنے مستقبل سے مایوسی نہ طاری ہو جائے۔

کیونکہ مایوسی ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے بعد انسان کی صلاحیتیں استعمال میں نہیں آیا کرتیں۔ بلکہ وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اور خشک ہو جاتی ہیں۔ تو قوم کو مایوسی سے بچانا بہت ضروری ہے۔ اور کامیاب قائد وہی ہوا کرتا ہے جو اپنی قوم کے حوصلے بلند رکھے اور ان کے اوپر کسی قسم کی مایوسی نہ طاری ہونے دے۔ تو جب قوم کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں پھر وہ قوم رو بہ ترقی رہتی ہے۔

بات آپ سمجھ رہے ہوں گے۔ کہ آپ کے سامنے دینی مدارس کے خلاف جو کوشش جاری ہے اور اس کے اندر یہود و نصاریٰ کی سازشیں مؤثر ہیں۔ اور ان کی سازشوں کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ بعض اہل مدارس ذہنی طور پر مرعوبیت کا شکار ہو جائیں۔ کہ ہمیں حق بولنے، حق کہنے سے احتیاط کرنی چاہیے۔ کہیں ایسے ہی ہمارا حال نہ ہو۔ جو حق کہنے والوں کا اس ملک کے دارالحکومت میں ہوا ہے۔ تو یہ مرعوبیت آسکتی ہے۔

بنی اسرائیل کی ابتداء

تو میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ بنی اسرئیل، جس کا مصداق اس وقت عیسائی اور یہودی ہیں۔ ان کی ابتداء حضرت یعقوب علیہ السلام سے ہوئی ہے۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ہی دوسرا نام اسرائیل ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور ان کے (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے جن کا نام اسرائیل ہے) بارہ بیٹے تھے۔ اور بارہ بیٹوں سے ان کے بارہ خاندان آگے چلے۔

بنی اسرائیل کی فطرت میں سازش

تو بنی اسرائیل کی ابتداء یہاں سے ہوئی ہے۔ لیکن اللہ بہتر جانتا ہے، اس کی حکمتوں کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔

- باپ بھی نبی۔
- دادا بھی نبی۔
- پردادا بھی نبی۔
- یعقوب علیہ السلام ان کے باپ..........وہ بھی نبی۔
- اسحٰق علیہ السلام ان کے دادا..............وہ بھی نبی۔
- ابراہیم علیہ السلام ان کے پردادا..........وہ بھی نبی۔

لیکن اس نسل میں چال بازی، سازشیں، کدھر سے آ گھسیں؟ خاندان تو سارا نبوت کا ہے۔ اس خاندان کے افراد نے سب سے پہلے سازش اپنے باپ اور اپنے بھائی کے خلاف کی۔ تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھنے والے بھی جانتے ہیں اور

- اپنے باپ کو کتنا بڑا چکر چلایا؟
- اپنے بھائی پر کتنا بڑا ظلم کیا؟
- کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ
- ان کو گھر سے لے جانے کا۔
- پھر بھیڑیے کے کھانے کا۔
- پھر کنویں میں ڈالنے کا۔
- پھر غلام بنانے کا۔

سارے قصے آپ سنتے رہتے ہیں۔ اور قرآن کریم نے ان کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ ان دس بھائیوں کی سازش تھی۔ اور اس سازش میں انہوں نے اپنے بھائی کے بھائی ہونے کا خیال نہیں کیا اور اپنے بوڑھے باپ کے باپ ہونے کا خیال

نہیں کیا۔ اس سازش میں انہوں نے اپنے باپ کو بھی رلایا اور بھائی پر بھی جتنا ظلم کر سکتے تھے انہوں نے ظلم کیا۔ تو اس خاندان کی فہرست میں پہلے دن سے ہی سازش اور ظلم وستم آیا ہوا ہے۔

سازش کا انجام

لیکن اللہ کی حکمت کہ اس ظلم وستم کے نتیجے میں پھر یہ ذلیل ہوئے اور ذلیل کرنے والا بھی اسرائیلی ہی تھا۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام ۔ ان کے گھٹنے اس نے لگوائے ۔ وہ واقعہ بھی آپ سنتے رہتے ہیں ۔ کہ جب یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے کھڑے ہوئے .... اِنَّا كُنَّا خَاطِئِيْنَ....(یوسف آیت ۹۱) ..کا اعتراف کیا۔ اور یوسف علیہ السلام جو کہ حق پرست تھے ان کے رحم دل نے پھر ان کو معاف کر دیا۔ اور اعلان کر دیا

"لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ "(یوسف آیت ۹۲)

تو ان سے درگذر کر گئے ۔ تو اس سازش کا اختتام یوں ہوا۔ کہ کرنے والے بھی اسرائیلی اور اس سازش کا توڑ مہیا کرنے والا بھی اسرائیلی ۔

اور اب یہ ساری کی ساری دنیا جو فتنہ فساد کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہے ۔ آپ جانتے ہیں ۔ کہ یہ ساری کی ساری سازشیں جتنی ہیں۔ یہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے ہیں جو کہ اسرائیلی ہیں ۔ اور پوری کی پوری دنیا ایک عذاب کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہے۔ اب یہ دونوں امت محمدیہ کے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں ۔ لیکن سرور کائنات ﷺ نے آنے والے حالات کے متعلق جو پیش گوئیاں کی ہیں۔ جن کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں کبھی بھی مایوسی کی طرف نہیں جانا چاہیے۔

غزوہ احزاب کا منظر

حالات جو بھی آ رہے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئیوں کے مطابق آ رہے ہیں ۔ مدینہ منورہ میں جس وقت پورے عرب کے قبائل نے اکٹھے ہو کے مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا تھا۔ جس کو ہم غزوہ خندق یا غزوہ احزاب کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں ۔ تو

منافقوں کے دل دہل گئے، وہ تو ڈر گئے، لیکن جو ایمان والے تھے، انہوں نے ان لشکروں کو دیکھ کر کہا

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (سورہ احزاب آیت ۲۲)

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اللہ کے رسول نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ اہل کفر تمہیں تکلیفیں پہنچائیں گے۔ جیسے قرآن میں ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (سورہ بقرہ آیت ۲۱۴)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جنت میں بھی داخل ہو جاؤ گے اور پہلے لوگوں کے حالات بھی تم پر نہیں آئیں گے؟

تو مؤمنوں نے کہا کہ یہ تو وہی آزمائشیں ہم پر آرہی ہیں۔ جن کا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اس لیے وہ ڈٹ گئے۔ جب ڈٹ گئے تو جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے سامنے ہے۔ البتہ منافق اس وقت دہل گئے تھے۔ اور ان کا کردار ایسے ہی ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی

رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ایمان کے اوپر جمنا اور ایمان کو مضبوطی سے تھامنا اس طرح سے ہوگا جس طرح سے آگ کا انگارہ لے کر مٹھی بند کی جائے۔ آپ ذرا اس تکلیف کا تصور کر لیں۔ آگ کا انگارہ ہاتھ میں لے کر مٹھی بند کرنا، قبض علی الجمرة جس طرح سے باعث تکلیف ہے ایمان کو سنبھالنا اور ایمان پر جمنا ایسے ہی باعث مشکل ہوگا۔ تو اب اگر ایسے حالات ہو جائیں تو ہم تو یہی کہیں گے۔

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (سورہ احزاب آیت ۲۲)

یہ تو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہے۔ اور یقیناً اس طرح

سے ہوگا اور اہل ایمان ان مشکلات میں پھنسیں گے۔

دجال کے ساتھ پانی اور آگ

حدیث شریف میں آخری دور کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک دجال آئیگا۔ وہ اصل کے اعتبار سے یہودی ہوگا لیکن عیسائی بھی سارے اس کے ساتھ ہوں گے۔ عیسائی اور یہودی اکٹھے ہوں گے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ پانی کی نہر بھی ہوگی اور آگ بھی ہوگی۔ جو شخص اس کا زمانہ پالے وہ آگ کو اختیار کرے، پانی کو اختیار نہ کرے۔ کیونکہ بظاہر جو دیکھنے میں آگ ہوگی وہ حقیقت میں پانی ہوگا۔ اور جو بظاہر دیکھنے میں پانی ہوگا وہ حقیقت میں آگ ہوگی۔

(ذرا بات کو سمجھیں)۔ اللہ کی کلام اور اللہ کے رسول کی کلام میں جو حکمتیں ہیں وہ اللہ اور اس کا رسول ہی خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ہم اپنی ناقص سمجھ کے مطابق اس کی تعبیریوں کر سکتے ہیں کہ آگ تو آگ ہے ہی۔ یہ تو ہے فنائیت کی علامت۔ یہ جہاں آجاتی ہے وہاں ہر چیز کو بھسم کر دیتی ہے، ختم کر دیتی ہے۔ آگ کا تو یہ کام ہے۔ اور پانی کا کام ہے خوشحالی۔ تو یہ خوشحالی اور حیات لاتا ہے۔

"وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (سورہ انبیاء آیت ۳۰)

تو یہ

- زندگی کا باعث ہے۔
- سرسبزی کا باعث ہے۔
- شادابی کا باعث ہے۔
- خوشحالی کا باعث ہے۔
- کشادگی کا باعث ہے۔

تو اگر اس کو اس بات سیکنایہ بنایا جائے۔ تو علی الاحتمال اس بات کی گنجائش ہے۔ کہ دجال کو اس وقت دنیا میں اتنا اقتدار حاصل ہوگا کہ نہ ماننے والوں کے حصے میں

آگ اور ماننے والوں کے حصے میں خوشحالی ۔اور رسول اللہ کا مشورہ یہ ہے کہ آگ کو برداشت کر لینا لیکن دجال کی دی ہوئی خوشحالی کو اختیار نہ کرنا ۔ کیونکہ جو آگ کو اختیار کریں گے اور اس کی آگ میں جل جائیں گے ۔ان کیلئے خوشحالی ہی خوشحالی ہے ۔اور جو اس کی عنایات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سمجھیں گے کہ ہم خوشحالی اختیار کر رہے ہیں ۔تو وہ حقیقت کے اعتبار سے جہنم کی آگ ہے۔

یہ رسول اللہ کا مشورہ ہے ۔تو جب یہ حالات آ جائیں کہ جو دجال کو مانیں وہ خوشحالی اور جو دجال کو نہ مانیں ان کے لیے آگ تیار ۔تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تعلق، ان پر اعتماد، اور ان پر ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ آگ میں جلنے کے لیے تیار رہیں۔ لیکن دجال کی اطاعت کر کے خوشحالی لینے کے لیے تیار نہ رہیں۔

روحانیت اور مادیت کا مقابلہ

تو ایسے سخت سے سخت حالات کیلئے بھی انسان کو تیار رہنا چاہیے۔ بسا اوقات ظاہری حالات مایوس کن ہوتے ہیں اور یہاں بھی یہی حالات ہوں گے مایوس کن ۔ لیکن جیسے یہ یہود ونصاریٰ اپنی ان چالبازیوں کے ساتھ اور اپنی ان سازشوں کے ساتھ دنیا کے اوپر حاوی ہوتے ہوئے نظر آئیں گے ۔ اور ان کے بالمقابل مؤمن انتہائی بدحالی میں ہوں گے اور بے چینی میں ہوں گے ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستگیری ہوگی جس شخصیت کی راہ نمائی کی گئی ہے، اطلاع دی گئی ہے ۔ کہ حضرت عیسیٰ کا نزول اسی دور میں ہوگا اور حضرت عیسیٰ جو آئیں گے تو آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی اسرئیلی ہیں ۔تو اسرائیلیوں کے مقابلے میں پھر اسرائیلی نبی ہی آئے گا ۔اور نبی کے آنے کے بعد پھر مقابلہ ہوگا ظاہری اسباب کا اور روحانیت کا ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روحانیت کے بادشاہ ہوں گے اور دجال کے پاس سارے کے سارے ظاہری اسباب ہوں گے ۔اب روحانیت اور مادیت کا مقابلہ ہوگا۔

یاد رکھیے! روایات سے کچھ اشارے ایسے نکلتے ہیں ۔ کہ ان بموں کے مقابلے

میں عیسیٰ نے

- بم نہیں چلانے۔
- میزائل نہیں چلانے۔
- گولے نہیں پھینکنے۔
- بمباری نہیں کرنی۔

عیسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ اسباب نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کے پاس روحانیت ہوگی۔ ان کی روحانیت کے اثر سے مادی اسباب سارے کے سارے بیکار ہو جائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی تاثیر

جیسا کہ حدیث میں آپ نے پڑھا کہ رسول اللہ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام س وقت آئیں گے تو کوئی کافر ان کے سانس کا اثر محسوس نہیں کرے گا مگر مر جائے گا۔ سانس کا اثر محسوس کرتا ہوا مر جائے گا۔ اور پھر فرمایا کہ جہاں تک ان کی نگاہ جائے گی وہاں تک ان کے سانس کا اثر جائے گا۔

تو مطلب یہ ہوا کہ پہلی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سانس مردوں کو زندہ کرتا تھا اور آخری زندگی میں ان کا سانس زندوں کو مارنے کیلئے مؤثر ہوگا۔ اگر آپ پہلا معجزہ تسلیم کرتے ہیں تو دوسرا معجزہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ مردے کو پھونک مارتے تھے تو وہ زندہ ہو جاتا تھا۔ اور دوسرا معجزہ ان کا یہ ہوگا کہ جہاں تک آپ کی نگاہ جائے گی تو آپ کا سانس اثر انداز ہوگا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کافر دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا تو یہ وہیں سے پھونک ماریں گے تو وہ مر جائے گا۔ اب بتاؤ کہ یہ انقلاب روحانی ہے یا مادی؟

یہودیوں کی شامت

اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت یہاں کسی پتھر کے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہوگا۔ تو وہ پتھر آواز دے گا۔

"یَا مُسْلِمُ! هٰذَا یَهُوْدِیٌّ وَرَائِیْ فَاقْتُلْهُ"

اے مسلمان! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے۔ اس کو آ کر مار دے۔

درخت کے پیچھے چھپیں گے تو وہ درخت آوازیں دے گا۔

"یَا مُسْلِمُ! هٰذَا یَهُوْدِیٌّ وَرَائِیْ فَاقْتُلْهُ"

اے مسلمان! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے۔ اس کو آ کر مار دے۔

(بخاری۔ ۱/۴۱۰۔ مشکوۃ ۱/۴۶۶)

اب بتاؤ کہ یہ انقلاب روحانی ہے یا مادی؟ کہ نہ ان کو پتھر پناہ دیں گے، نہ ان کو درخت پناہ دیں گے۔ تو اس وقت جا کے جنگ کا خاتمہ ہوگا۔

فتح وشکست کا فیصلہ کب ہوتا ہے؟

اور دنیا کا اصول ہے کہ اگر جنگ سو سال بھی جاری رہے تو نہ کوئی جیتنے والا ہوتا ہے، نہ کوئی ہارنے والا ہوتا ہے۔ جیت، ہار کا فیصلہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ جتنی دیر تک بھی جنگ جاری رہے، جنگ کے دوران فتح اور شکست کا فیصلہ نہیں ہوتا۔

- آج ایک پسپا ہو رہا ہے
- کل کو دوسرا پسپا ہو جائے گا۔
- آج اس کے آدمی مارے جا رہے ہیں۔
- کل کو اس کے آدمی مارے جائیں گے۔
- آج اس کا وار کامیاب ہو گیا۔
- کل کو دوسرے کا وار کامیاب ہو جائے گا۔

یہ نشیب وفراز چلتا رہتا ہے۔ فتح وشکست کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب دونوں فریق تھک ہار کر ہتھیار رکھ دیں۔ اس وقت پھر پتہ چلتا ہے کہ کون کامیاب ہوا اور کس نے شکست کھائی؟

اس لیے یہ کشاکشی تو جاری ہے اور اس نے جاری رہنا ہے۔ اس میں فتح و شکست کی بات نہیں ہے۔ جس وقت جنگ کا خاتمہ ہوگا اس وقت پتہ چلے گا کہ یہودیوں کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور عیسائی حضرت عیسیٰ کو پہچاننے کے بعد ایمان لے آئیں گے۔ (جیسے قرآن کریم (سورہ نساء آیت ۱۵۹) میں اشارہ موجود ہے) تو عیسائی بچ جائیں گے۔ ورنہ اگر یہود کا ساتھ دیں گے تو یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور رسول اللہ نے فرمایا کہ دین واحد ہو جائے گا۔ اس دین اسلام کے مقابلے میں کوئی دین زمین کے اوپر نافذ نہیں رہے گا۔ تو آخری آخری فتح اہل ایمان کی ہے۔

ہماری ہمدردیاں لال مسجد کے ساتھ

اس لئے اس لڑائی میں مایوسی والی کوئی بات نہیں۔ سخت سے سخت حالات بھی آ سکتے ہیں۔ اب یہ سب کچھ جو آپ کے سامنے اسلام آباد میں ہوا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی طاغوتی طاقتوں نے اپنے نشے میں آکر سب کچھ کیا ہے۔

- بات بالکل صاف ہے۔
- بات بالکل سیدھی ہے۔
- فیصلہ بالکل دوٹوک ہے۔

کہ

- ہماری ہمدردیاں .... ہماری تائید۔
- ہمارا زور .... ہمارا پلہ۔
- ہماری محبتیں .... ہمارے جذبات۔

ان طلباء کے ساتھ ہیں، ان علماء کے ساتھ ہیں، جنہوں نے ایک صحیح بات کا مطالبہ کیا تھا کہ اس ملک کے اندر جو اسی وجہ سے وجود میں آیا ہے کہ

- یہاں اسلامی حکومت ہوگی۔
- یہاں اسلامی نظام ہوگا۔

- یہاں اسلامی تہذیب ہوگی۔
- یہاں خلافت راشدہ کا نظام ہوگا۔
- یہاں اسلام کا بول بالا ہوگا۔

ساٹھ سال ہو گئے صبر کرتے ہوئے، مطالبے کرتے ہوئے۔ لیکن کوئی مانتا نہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے فہم کے مطابق ایک راستہ اختیار کیا جو عام طور پر علماء نے کہا کہ یہ تشدد کا راستہ ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ پھر ہمیں کوئی اور رستہ بتاؤ، ہم کون سا رستہ اختیار کریں؟ چنانچہ اپنے جذبے میں آکر، اپنے جوش میں آکر انہوں نے حالات کے ساتھ مصالحت نہیں کی۔ باقی کوئی ایسا جرم ان سے صادر نہیں ہوا تھا جس کی بناء پر آپ نے ان کو اتنی بڑی سزا دینے کا جواز پیدا کر لیا۔ کہ ان کو

- آگ کے اندر بھون کر رکھ دیا۔
- آگ کے اندر جلا کر رکھ دیا۔
- خون میں لت پت کر دیا۔
- ان کے جسموں کے لوتھڑے اڑا دیے۔
- ان جسموں کو چھلنی کر دیا۔
- ان کو گندے نالوں میں اٹھا کر پھینک دیا۔
- ان کا جنازہ تک نہیں پڑھنے دیا۔

اس پر مزید یہ کہ اسلام آباد کی میٹنگ کے بعد انہوں نے واشگاف الفاظ میں، بلا خوف لومۃ لائم، اس ساری کارروائی کا ذمہ دار ایوان صدر کو ٹھرایا۔ کہ مذاکرات کامیاب ہو رہے ہوتے تھے، کامیاب ہونے کے قریب جاتے تھے، اور ادھر سے کوئی سرکاری کارندے ان کو رد کر دیتے تھے۔

- یہ بات چھپ چکی ہے۔
- اخباروں میں آ چکی ہے۔

- رسالوں میں آچکی ہے۔
- میڈیا پہ آچکی ہے۔

یہ انہی کی بات نقل کر رہا ہوں۔کہ انہوں نے ساری کی ساری ذمہ داری ایوان صدر پر ڈالی ہے۔

حوصلے بلند رکھیں

بہر حال طلباء کی یہ جماعت جو آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ان شاء اللہ العزیز انہی میں سے ہی ہوں گے جو آنے والے وقت میں اس دین کا احیاء کریں گے۔اور دوبارہ دین کی رونق اسی طرح سے غلبے کے ساتھ نمایاں ہوگی جس طرح سے ہونی چاہیے۔

آپ حوصلے بلند رکھیں۔جنگ کے اندر مرنا بھی ہوتا ہے اور مارنا بھی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے۔

" فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ "(سورہ توبہ آیت ۱۱۱)

وہ قتل کرتے ہیں، اور قتل ہوتے ہیں۔

جب آپ نے ایک تہیہ کرلیا ہے اور دین کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔پھر خوف اپنے اوپر مسلط کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔آپ کہیں "ٹھیک ہے۔جو ہو رہا ہے یہ تو سلسلہ چلتا آرہا ہے اور چلے گا۔شرافت آئے گی تو شرافت کے ساتھ چلیں گے۔اور اگر دوسری طرف سے ظلم ہوا تو اس وقت تک سہیں گے جب تک اس ظلم کا جواب دینے کیلئے ہمارے پاس کوئی قوت، طاقت نہیں آئیگی۔سہتے رہیں گے، کوئی بات نہیں۔حوصلہ نہیں ٹوٹنا چاہیے۔اس سے پہلے بہت دفعہ ایسے حالات آچکے ہیں۔کہ جن کی موجودگی میں ہمارے اکابر نے، ہمارے بزرگوں نے قوم کے حوصلے نہیں ٹوٹنے دیے۔آخر آپ نے دیکھا کہ جس کی حکومت میں، جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔آخر وہ بھی بستر اگول کرنے پر مجبور ہو گئے۔آج کل کی حکومتیں تو ایسی نہیں ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مساکین کے ہاتھوں یہ کس طرح سے ذلیل اور پریشان ہیں۔ اوران شاء اللہ العزیز اس کا نتیجہ بھی وہی ہوگا کہ ان کے حق میں ذلت اور رسوائی اور پستی گی اور آخر کار فتح اسلام کی ہوگی۔

مدارس کا کردار

اس لیے حوصلے بلند رکھیں، جذبات بلند رکھیں۔ اور جذبہ بلند رکھنے کیلئے دینی تعلیم سب سے اہم کردار اداہ کرتی ہے۔ قرآن وحدیث ہی تو ہے جو انسان کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ اسی لئے ان کا سب سے زیادہ نشانہ مدارس ہیں۔ کہ یہی مدارس ہیں جہاں ان کو یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ موت ڈرنے کی چیز نہیں، موت تو مسلمان کی ایک محبوب چیز ہے۔

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ (مشکوۃ ۱۴۱)

کہ اللہ کی طرف سے موت مؤمن کو تحفہ ملتا ہے۔

دنیا سے تو ہر کسی نے جانا ہے۔ کوئی ہمیشہ رہنے کیلئے نہیں آیا۔

- ظالم بھی مرے گا۔
- مظلوم بھی مرے گا۔
- حاکم بھی مرے گا۔
- محکوم بھی مرے گا۔
- جابر بھی مرے گا۔
- مجبور بھی مرے گا۔
- غالب بھی مرے گا۔
- مغلوب بھی مرے گا۔

لیکن بعض لوگوں کیلئے ان کی موت تحفہ ہوتی ہے۔ یہ سبق جو باقی ہے کہ موت وقت سے ٹلتی نہیں ہے۔ مرنا بہر حال ہے۔

- جنازے صرف میدانِ جہاد سے نہیں اٹھتے۔
- جنازے قلعوں سے بھی نکلا کرتے ہیں۔
- جنازے صرف جھونپڑیوں سے نہیں اٹھتے۔
- جنازے محلات سے بھی اٹھتے ہیں۔
- جنازے صرف فقیروں کے نہیں اٹھتے۔
- جنازے بادشاہوں کے بھی اٹھتے ہیں۔
- جنازے صرف کمزوروں کے نہیں اٹھتے۔
- جنازے پہلوانوں کے بھی نکلتے ہیں۔

تو موت وقت سے ٹلنے والی چیز نہیں ہے۔ جیسے اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح سے اس پر ایمان لانا ضروری ہے کہ موت کا وقت متعین ہے۔ آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ یہ سبق ہے جو مسلمان کو پڑھایا جاتا ہے جس کے ساتھ اس میں ہمت اور جرأت پیدا ہوتی ہے۔

یہ سبق جس وقت پڑھیگا اس وقت یہ مؤمن بزدل نہیں ہوا کرتا، ڈرا نہیں کرتا۔ باقی دنیا کے حالات ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تو قرآن و حدیث کی یہ تعلیم ہے جو اصل کے اعتبار سے مؤمن کے ایمان کو تروتازہ رکھتی ہے۔ اور کافر سب سے زیادہ اسی سے ہی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا ان مدارس کا باقی رکھنا ضروری ہے۔

انگریز کے مظالم اور مجاہدین کی استقامت

باقی تاریخ نے جس قسم کے ظلم وستم دکھائے ہیں۔ اور ظلم وستم دکھانے کے باوجود جس طرح سے حق باقی چلتا آیا ہے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ قیامت تک اس دین حق نے باقی رہنا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی کلام میں ہے کہ انگریز جب ہندوستان پر غالب آیا۔ تو

غلبہ پانے کے بعد دہلی کے چاندنی چوک میں اس نے یہ کردار ادا کیا۔ کہ مجاہدین کی قطاریں لگی ہوتی تھیں، ایک ایک مجاہد کو سامنے کھڑا کر کے توپ کے ساتھ اڑایا جاتا تھا۔

- سر وہ جا رہا ہے۔
- بازو وہ جا رہا ہے۔
- ٹانگیں وہ جا رہی ہیں۔

تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیکن جھوٹ بولنے کیلئے بھی ایک نوجوان نے معافی نہیں مانگی۔ ایک تو جون نہیں تھا جو معافی مانگتا۔

- توپوں کے ساتھ اڑ گئے۔
- اپنے بدن کے ذرے کروا لئے۔
- اپنے جسم کو چھلنی کروالیا۔
- سر دھڑ کی بازی لگا دی۔
- آگ میں جلنا برداشت کر لیا۔
- تیل میں تلنا برداشت کر لیا۔

لیکن معافی نہیں مانگی۔ پھر بالآخر ان کی اس جرأت نے وہ نسل پیدا کی کہ جس سے آخر انگریز بستر ا گول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جنگ میں تو ایسے ہوا کرتا ہے۔ ہماری کتاب الجہاد یہی تو بتاتی ہے۔ اسی لیے یہ سارے کے سارے ان باتوں سے ڈرتے ہیں۔

بہر حال قرآن و حدیث کی تعلیم دینے والے یہ مدارس اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ اور پورے مؤمنین کا فرض بنتا ہے کہ ان کے تحفظ میں کوشش کریں۔ باقی نشیب و فراز آ جایا کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کی حفاظت فرمائے اور مدارس کو آباد رکھے۔ آمین۔

بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس

باقی رہا حدیث شریف کی یہ روایت۔ تو اس کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ ہر سال اسی اسٹیج پر، اسی جگہ، اس کے اوپر تقریر ہوتی ہے۔ اور جگہ بجگہ مدارس میں یہ تقریب ہوتی ہے۔ اس لیے زیادہ لمبی بات کرنے کی تو ہمت بھی نہیں ہے۔ اس کے ترجمہ پر ہی اکتفاء کروں گا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وحی کے تذکرے سے کلام کی ابتداء کی تھی۔ اہل علم اس بات کو بہت آسانی سے اور طلبہ بھی سمجھ جائیں گے کہ وحی معیار ہے عمل کے صحیح ہونے کا۔ وحی معیار عمل بھی ہے، معیار عقیدہ بھی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ معیار حق ہے کہ حق و باطل کے درمیان اگر کوئی فرق کرنے والی چیز ہے تو وہ وحی ہے۔ اس لئے پہلے اس کا تذکرہ کیا اور پھر عمل میں اخلاص پیدا کرنے کے لئے تصحیح نیت ضروری ہے۔ اس لیے اس کا تذکرہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے سارے کے سارے احکام درجہ بدرجہ عبادات، معاملات، معاشرت سارے ابواب ذکر کر کے آخر میں کتاب التوحید لائے۔ اور کتاب التوحید کے آخر میں جا کر وزن اعمال کا تذکرہ کیا۔ اور آپ کو آخرت یاد دلا دی۔ کیونکہ آخرت ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا تصور انسان کی عملی زندگی میں توازن پیدا کرتا ہے۔ جب آپ کے ذہن میں یہ ہوگا کہ

- میرا یہ قول ضائع نہیں۔
- میرا یہ عمل ضائع نہیں۔
- میرا یہ کام ضائع نہیں۔

جب انسان اس بات کو سوچے گا تو پھر حق پر قائم رہنے کی کوشش کرے گا۔ اور باطل سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ تو وزن اعمال کا تذکرہ کر کے آپ کو آخرت یاد دلائی ہے۔ اور پھر آخرت یاد دلانے کیلئے جو روایت اختیار کی ہے اس میں ذکر اللہ کی فضیلت ہے کہ اللہ کا ذکر انسان کی زبان پر جاری رہے اور عمل میں اخلاص ہو اور انسان کا مقصد:

اور عمل وحی کے مطابق ہو۔تو یہ انسان کی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔

تو آخر میں سبحان اللہ وبحمدہ پر جو اس کا اختتام کیا ہے۔ ویسے بھی حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ہر مجلس کے اختتام پر کچھ پڑھا کرتے تھے۔تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا یارسول اللہ آپ آخر میں کیا پڑھتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا میں یہ تسبیح پڑھتا ہوں۔

" سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ "(نسائی ۱۵۰/۱.مشکوۃ ۲۱۶)

اور فرمایا کہ یہ مجلس کا کفارہ ہے اس مجلس میں اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو تو اللہ تعالی اس ذکر کی برکت سے معاف فرما دیتے ہیں۔

تو حضرت امام بخاری رحمہ اللہ آخر میں جو اس روایت کو لائے ہیں۔تو ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں بھی یہ بات ہو کہ اللہ کی تسبیح اللہ کی تحمید یہ کوتاہیوں کی معافی کا ذریعہ ہے۔ اگر چہ کتاب کے لکھنے میں، روایات کے جمع کرنے میں انسان کی وسعت کے مطابق جو کسی انسان کے بس میں ہو سکتا ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے کوشش کی ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کی۔

لیکن اس کے باوجود انسان ہے، خطاء ونسیان کا پتلا ہے، کمی، کوتاہی رہ سکتی ہے۔ جیسے واقعۃً بعض روایات کے اندر محدثین نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں دیکھو یہ وہم راوی ہے۔ یہاں یوں تھا اور یوں ہو گیا۔طلباء نے یہ باتیں مفصل پڑھی ہیں۔ تو آخر میں اللہ کے ذکر کیساتھ کسی قسم کی کمی کوتاہی ہو تو اس کو اللہ معاف فرما دے۔اللہ تعالی ہمیں بھی اپنے ذکر کی توفیق دے۔اور اپنے اعمال کو وحی کے مطابق درست رکھنے کی اور اخلاص نصیب فرمائے۔آمین۔

شہداءِ لال مسجد پر زبان نہ کھولیں

باقی ہم سب شہداء لال مسجد کیلئے دعا گو ہیں کہ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور ان کی جو کمی، کوتاہی ہے اللہ تعالی معاف فرمائے۔انہوں نے اپنے طور پر ایک فرض ادا

کیا ہے۔ باقی ان پر زبان نہ کھولیں۔ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا کیا درجہ ہوگا؟۔ ہم تنقید کر کے اپنی عاقبت کیوں برباد کریں؟

جو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہتے ہیں کہ سب نے سمجھایا تھا لیکن سمجھے نہیں۔ اور اگر کسی کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ چونکہ یہ سمجھے نہیں، رکے نہیں، اس لیے ان کو یہ سزا ملی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ بدترین قسم کی بات ہے۔ جو کسی کی زبان سے نکلتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور یہ بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے۔

شہداء لال مسجد اور واقعہ کربلا:

آپ کے سامنے ایک نمونہ موجود ہے۔ کہ اس سے پہلے ایک کربلا برپا ہو چکا ہے۔ جیسے یہاں غازی عبدالرشید رحمہ اللہ نے یہی کہا تھا۔ (یہ کربلا کا نمونہ ہے۔ کربلا میں کیا ہوا تھا؟ خاندانِ نبوت سارا قربان ہو گیا۔) لیکن اس کے باوجود خارجی قسم کے لوگ آج تک کہتے ہیں۔ کہ سمجھانے والوں نے سمجھایا تھا کہ نہ جاؤ۔ سارے روک رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ چلے گئے۔ تو کیوں گئے؟ یہ ذمہ داری ان کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ اب تک خارجی لوگ اس قسم کی بدزبانی کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جس جذبے کیساتھ سرشار تھے اور انہوں نے آنے والی امت کیلئے اس جذبے کو رو کے رکھا کہ

"خاندان تو قربان کئے جا سکتے ہیں لیکن کسی غلط بات کو قبول نہیں کیا جا سکتا"

تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جذبے کو امت کے اندر جذبہ جہاد باقی رکھنے کا کتنا بڑا ذریعہ بنایا کہ جب بھی ظلم کے خلاف اکڑنے کی بات آتی ہے تو لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اسوہ پیش کرتے ہیں۔ اور یوں کہتے ہیں۔

که دو وقت کے یزیدوں کو
ہم حسینی مزاج رکھتے ہیں

تو حسینی مزاج ایسا چھوڑا ہے کہ جس کو یاد کر کے نوجوان باطل کے ساتھ ٹکرانے کا

جذبہ پیدا کرتا ہے۔ تو یہ صدقہ جاریہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہے جس نے جذبہ شہادت ہمیشہ کیلئے زندہ کر دیا۔

ہمارے سید محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جو سکھوں کے مقابلے میں لڑنے کیلئے آئے اور بالاکوٹ میں شہید ہو گئے منافقین کی سازش کی بناء پر۔ کیونکہ نقصان پہنچتا ہی اس وقت ہے جس وقت کافروں کے ساتھ کچھ منافقین، اپنے آپ کو بظاہر مسلمان کہلانے والے مل جاتے ہیں۔

ٹھیک ہے وہ سارے شہید ہو گئے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہیں سے جذبہ جہاد ایسا تسلسل کے ساتھ جاری ہے کہ اسی کے نتیجے میں آخر ملک آزاد ہوا اور انہی کے نام پر نوجوانوں کے اندر مرنے مارنے کا جذبہ موجود ہے۔ ایسے لوگ تو چلے جاتے ہیں، جان دے دیتے ہیں لیکن پیچھے آنے والی نسلوں میں اس کے اثرات بہت قوی ہوا کرتے ہیں۔ تو اس طرح سے ابھی کچھ صحیح طرح سے حالات سامنے نہیں آ رہے کہ کیا کیفیات گذری تھیں؟۔ کیا بات تھی؟ اور کیا بات نہیں تھی؟

بہر حال ہم اہل حکومت کیلئے بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کو توفیق دے، ہدایت دے، اور پاکستان جس مقصد کیلئے بنا تھا اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے کسی وقت تو کوئی شخص سامنے آ جائے، جو کہے کہ یہ اسلامی ملک اسلامی قانون کیلئے بنا تھا، خلافت راشدہ کیلئے بنا تھا، پچھلا حاکم نہیں کر سکا چلو ہم کرتے ہیں۔ کان اس بات کو سننے کیلئے ترس گئے، ساٹھ سال ہو گئے اس دھوکے میں پڑے ہوئے۔ مطالبے ہوتے ہیں لیکن کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ ان کو ہدایت دے اور اگر ان کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے ہمارے مدارس کو، ہمارے ملک کو محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجھ سا کوئی نہیں!

اے رسولِ امیں، خاتمُ المرسلیں ﷺ! تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
ہے عقیدہ یہ اپنا بصدق و یقیں: تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

اے براہیمی و ہاشمی خوش لقب! اے تو عالی نسب، اے تو والا حسب
دودمانِ قریشی کے دُرِّ ثمیں: تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

دستِ قدرت نے ایسا بنایا تجھے، جملہ اوصاف سے خود سجایا تجھے
اے ازل کے حسیں، اے ابد کے حسیں! تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

بزمِ کونین پہلے سجائی گئی، پھر تری ذات منظر پہ لائی گئی
سیّدُ الاوّلیں، سیّدُ الآخریں! تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

تیرا سکّہ رواں کل جہاں میں ہُوا، اس زمیں میں ہُوا، آسماں میں ہُوا
کیا عرب، کیا عجم، سب ہیں زیرِ نگیں! تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

تیرے انداز میں وسعتیں فرش کی، تیری پرواز میں رفعتیں عرش کی
تیرے انفاس میں خلد کی یاسمیں: تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

"سدرۃ المنتہیٰ" رہگزر میں تری ، "قاب قوسین" گردِ سفر میں تری
تو ہے حق کے قریں ، حق ہے تیرے قریں؛ تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

کہکشاں ضو ترے سرمدی تاج کی، زلفِ تاباں حسیں رات معراج کی
"لیلۃ القدر" تیری منوّر جبیں؛ تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں

مصطفیٰ، مجتبیٰ، تیری مدح و ثنا ، میرے بس میں نہیں، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں ، لب کو یارا نہیں؛ تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

کوئی تیرے کیسے سراپا لکھوں ، کوئی ہے! وہ کہیں جس کو تجھ سا کہوں
توبہ توبہ ، نہیں کوئی تجھ سا نہیں؛ تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں

(رضی اللہ عنہم)
چار یاروں کی شانِ جلی ہے بھلی؛ ہیں یہ صدیقؓ ، فاروقؓ ، عثمانؓ ، علیؓ
شاہدِ عدل ہیں یہ ترے جانشیں؛ تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں

اے سراپا نفیسؔ ، انفسِ دو جہاں ، سرورِ دلبراں ، دلبرِ عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے میری جانِ حزیں؛ تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں

وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم

نفیس الحسینی